قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریّا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدّین اکبر

ناشر: عطاءُ الرحمٰن آرائیں

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النّور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
حقیقتِ حدیث	مولانا اسلم جیراجپوری	۸
تمسک بالکتاب	علامہ غلام احمد پرویز	۲۳
سیرتِ رسالتمآبؐ کا معاملاتی پہلو	ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی	۳۹
مومنین اور کفار	محمد اسلم رانا	۴۵
قرآن خوانی یا قرآن فہمی	علی محمد چدھڑ	۴۹
قرآن کا معاشی نظام	عبداللہ ثانی	۵۵
قرآن کا معاشی نظام	قمر پرویز	۶۴
حقائق و عبر	ادارہ	۷۰
اسلامی لیبل	آصف جلیل	۷۲
بچوں کا صفحہ	ادارہ	۷۴
اشتہار کتب		۷۶
اعلاناتِ درسِ قرآن	ادارہ	۷۸

جلد ۴۵ ——— مئی ۱۹۹۲ء ——— شمارہ ۵

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: -/۱۰ روپے

لمعات

اتّحاد بین المسلمین

ملّتِ اسلامیہ صدیوں سے جس افتراق و انتشار میں مبتلا چلی آرہی ہے اس کی داستانِ غم ہماری ہر مجلس میں دہرائی جاتی ہے، ہر اسٹیج سے اس کا رونا رویا جاتا ہے، ہر منبر و محراب سے اس پر غم کے آنسو بہائے جاتے ہیں معاملہ اسی رونے دھونے پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس افتراق و انتشار کو وحدت و اخوت اور اتحاد و ائتلاف میں بدلنے کے لئے ہمارے ہاں کئی تجاویز سوچی جاتی ہیں، کئی اقدامات بروئے کار لائے جا چکے ہیں۔ کئی تحریکیں اتحادِ ملّت کی دعوت لے کر میدان میں آچکی ہیں۔ آج بھی اخبارات میں اس قسم کی کوششوں کا چرچا سنائی دے گا۔ پاکستان میں اسلامی بلاک، اسلامی دولتِ مشترکہ، پاکستان، ایران اور ترکی کا معاہدہ، اُمتِ مسلمہ کا اتحاد بنام ای سی او اور او آئی سی سعودی عرب میں اسلامی رابطہ کونسل کی تشکیل، مصر کی جمعیت اتحاد اسلامی سب اسی سلسلۂ دراز کی مختلف کڑیاں ہیں اور اگر عہدِ رفتہ کا جائزہ لیجئے تو نظر آجائے گا کہ مسلمانانِ عالم کے اتحاد کی یہ کوششیں اپنے مقصود و منتہا کے اعتبار سے کوئی نئی دعوت نہیں۔ اس سے قبل علامہ جمال الدین افغانی کی پان اسلام ازم کی تحریک، متحدہ ہندوستان کی تحریکِ خلافت، قاہرہ میں مؤتمرِ خلافت کا بین الملّی انعقاد بھی انہی محرّکات کے آئینہ دار بن کر منظرِ عام پر آئے تھے۔

کسی شخص کو بھی اس سے مجالِ انکار نہیں کہ یہ مقاصد بڑے نیک اور قابلِ قدر ہیں اور جو لوگ مختلف اوقات میں ان مقاصد کو لے کر اٹھے یا ان کی بجاآوری کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں، ان کے خلوص اور حسنِ نیت پر بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن واقعات شہادت دیں گے کہ یہ کوششیں پہلے بھی صحرائے نامرادی میں دم توڑتی رہیں اور اب بھی اُن سے حقیقی منشاء کی بجاآوری ممکن نہیں۔ مسلمانوں کے اتّحاد اور وحدت و اخوت کی یہ مساعی بڑی مقدس اور پاکیزہ آرزوؤں کی مظہر سہی لیکن جب تک اس معاملے میں بنیادی حقائق اور اساسی نکات سامنے نہیں لائے جائیں گے ان مقدس آرزوؤں کے محسوس و مشہود نتائج کبھی مرتب نہیں ہوسکیں گے۔ آئیے آج اس بنیادی حقیقت پر سنجیدگی اور حقیقت پسندی سے غور کریں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ باہمی اتحاد و اشتراک کے کئی سلسلے ہمارے سامنے موجود ہیں اور کامیابی سے اپنے پیشِ نظر مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ برطانوی دولتِ مشترکہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس دولتِ مشترکہ میں پاکستان، ہندوستان، کینیڈا، آسٹریلیا، لنکا، برما جیسے کئی ملک تاجِ برطانیہ سے اپنا رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں اور تاجِ برطانیہ سے دوستی اور وفاداری اس کے لئے بنائے اشتراک قرار پا چکی ہے۔ کمیونسٹ ممالک میں بھی باہمی اتحاد کا ایک رشتہ قائم ہے اور کمیونزم اس کے لئے وجہِ اشتراک۔ افریقہ کے حبشی ممالک بھی باہمی اتحاد کی تحریک کو کامیابی سے آگے بڑھا رہے ہیں اور رنگ و نسل کی یکسانیت ان کے اس رابطۂ باہمی کی مشترک اساس ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم جو دُنیا کے مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں اور ان مسلمانوں کی مختلف سلطنتوں کے باہمی اتحاد اور وحدت و اخوت کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اور اس کے لئے آئے دن جو نئی تحریکیں بروئے کار آ رہی ہیں اس باہمی اتحاد کے لئے بنائے اشتراک کیا ہے۔ کہا جائے گا کہ مسلمانوں کے اتحاد کے لئے ان کے اس دعوے سے بڑھ کر اور وجہِ اشتراک کونسی ہو سکتی ہے کہ وہ سب مسلمان ہیں، ان کا خدا ایک ہے، ان کا رسول ایک ہے، ان کا کعبہ ایک ہے، ان کا قرآن ایک ہے۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے اور کون سی بنیاد ہو سکتی ہے جس کی ضرورت محسوس ہو۔ یہ جواب بظاہر بڑا دلکش اور معقول نظر آئے گا لیکن اے کاش! اس جواب کی تائید حقائق کی رُو سے بھی ہو سکتی۔ حقائق تو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ان دعاوی کے باوجود مسلمانوں میں اتحاد نہیں ـــ دیگر حقائق تو ایک طرف مختلف زمانوں میں مختلف مقامات سے اٹھنے والی تحریکیں اس حقیقت کی آپ شہادت ہیں کہ ان دعاوی کے باوجود مسلمانوں میں وحدت موجود نہیں۔

بات اس حد تک یقیناً درست ہے کہ حضور نبیٔ اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ کے دورِ ہمایوں میں مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ وہ مسلمان ہیں انہیں ایک سیسہ پلائی دیوار (بنیانٍ مرصوص) کی صورت دئے ہوئے تھا۔ ان کی صفوں میں اس دعویٰ کی بنا پر واقعی وحدت و اخوت کی ہم آہنگی اور یک رنگی بصد انداز یکتائی موجود تھی۔ واقعی ان کے دلوں میں اتحاد و ائتلاف کی نہر سلسبیل دوڑ رہی تھی لیکن قرنِ اوّل کی مختصر سی مدت کے بعد اتحاد و اخوت کی یہ جنت افتراق و انتشار کے شعلوں کی زد میں آئی اور آج تک یہ شعلے سرد نہیں پڑے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت جلد مسلمان اس اخوت کو کھو بیٹھے۔ وہ بدستور مسلمان کہلاتے رہے۔ وہ اپنے اس دعوے کو بھی بہ شد و مد دہراتے رہے کہ ہمارا خدا ایک، رسولؐ ایک، کعبہ ایک، قرآن ایک ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں باہمی عداوت بڑھتی گئی اور ان کے یہ دعاوی اس عداوت کو اخوت میں نہ بدل سکے۔

خود عربوں کو لیجئے۔ قرآن نے الاعراب اشد کفرا و نفاقا کے الفاظ میں اُن کے دورِ جاہلیت کی ایک تصویر پیش کی تھی۔ ان عربوں کو جو اسلام سے قبل کفر و نفاق کی شدت میں مبتلا اور ایک دوسرے سے

برسرِ جنگ چلے آرہے تھے، حضورؐ نے اخوت اور اتحاد کی وہ نعمت عطا کی جس کی مثال تاریخ میں موجود نہیں لیکن اس امر واقعہ سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جلد ہی یہ عرب دورِ جاہلیت کی روایاتِ کہن کی طرف پھر لوٹ گئے اور مسلمان کہلانے کے باوجود مدتوں سے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما چلے آرہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کا مسلمان ہونے کا دعویٰ اب اُن کے اتحاد کے لئے وجہ اشتراک نہیں بن سکا۔ ان کی عصبیتِ جاہلہ پھر عود کر آئی اور اس شدت سے اُبھری کہ آج انہیں عرب نیشنلزم کا نعرہ ہر شے سے عزیز تر ہے۔

اور آگے بڑھیے! حج کا سالانہ اور عالمگیر اجتماع دنیا بھر کے مسلمانوں کے اتحاد و ائتلاف کی سب سے بڑی دعوت تھا۔ وہاں ہر سال دنیا کے گوشے گوشے سے لاکھوں مسلمان جمع ہوجاتے ہیں۔ وہاں سب کا لباس ایک ہوتا ہے، سب کا خدا، رسول، کعبہ اور قرآن ایک ہوتا ہے۔ حج کے تمام مناسک یکساں طور پر ادا کئے جاتے ہیں لیکن یہ سب کچھ ایک ہونے کے باوجود ان کے دلوں کو ٹٹول کر دیکھئے اور خدا لگتی کہیئے کہ کیا ان کے دل بھی ایک ہوتے ہیں؟ کیا مصری، ہندی، ایرانی، افریقی اور شیعہ سنی، وہابی دیوبندی، بریلوی ہونے کی حیثیت سے ان کا باہمی اختلاف عرفات کے میدان اور طوافِ کعبہ تک کی مقدس رسوم میں نمایاں طور پر واضح نہیں ہوتا؟ آخر کیوں؟ یہ سب "مسلمان" ہوتے ہیں لیکن صاف ظاہر ہے کہ ان کا یہ مسلمانی کا دعویٰ اس عالمگیر اجتماع میں بھی انہیں ایک دوسرے کے بھائیوں کی حقیقی صورت عطا نہیں کرتا۔

اس صورت حال سے ہٹ کر خود اپنی حیاتِ ملی اور پاکستان کی طرف آیئے۔ اس میں شک نہیں کہ حصولِ پاکستان کی تحریک نے کچھ مدت کے لئے اس برِصغیر کے مسلمانوں میں ایک وحدت سی پیدا کردی تھی۔ وہ ایک قائد کے گرد ہنگامی طور پر جمع ضرور ہوگئے تھے لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہاں وجہ اشتراک ایک جداگانہ مملکت کا حصول تھا اور جونہی یہ مملکت حاصل ہوگئی وہ پھر صوبائی و نسلی عصبیتوں کی طرف لوٹ گئے۔ صوبائی اور نسلی تعصبات کی بیخ کنی کے لئے وحدتِ مغربی پاکستان کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ پٹھان پنجابی، سندھی، بلوچی اور بنگالی کے تعصبات اس زور و شور سے اُبھر آئے گویا خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریاں تند و تیز شعلوں کی صورت میں بھڑک اُٹھیں۔ یہ صورتِ حال بتا رہی ہے کہ ایک جداگانہ مملکت کا حصول تو کروڑوں مسلمانوں میں وجہ اشتراک بن گیا لیکن خود ان کا مسلمان ہونے کا دعویٰ انہیں متحد نہ کرسکا اور جوں ہی وہ پہلی وجہ اشتراک ختم ہوئی، دینِ خداوندی پر ایمان رکھنے کے یہ مدعی پھر آپس میں دست و گریباں ہوگئے۔

یہ ہے وہ حقیقتِ حال جس سے دنیا بھر کے مسلمان دوچار ہیں اور آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے دوچار ہیں۔ خود ہمارے اپنے گھر کی کیفیت بھی سب کے سامنے ہے۔ اس کیفیت کی موجودگی میں جب ہم اسلامی بلاک یا اسلامی دولتِ مشترکہ کے قیام کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو ہمیں قانونِ فطرت کی اس آواز سے کان بند نہیں

کرنے چاہئیں جو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

تو درونِ دریچہ کردی کہ برونِ خانہ آئی

ہمارے اپنے گھر میں کروڑوں مسلمان سندھی، بلوچی، پنجابی اور پٹھان ہونے کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کے مسلمان ہونے کا دعویٰ ان میں اخوت و اتحاد کی حقیقی صورت پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا لیکن ہمارے دل میں یہ ولولہ موجزن ہو رہا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو یکجا کر کے ایک اسلامی دولتِ مشترکہ کا قیام عمل میں لائیں یا ایک اسلامی بلاک کو تشکیل دیں جو مسلمانانِ عالم کی نمائندگی اور قیادت کا فریضہ سرانجام دے۔ ہم ایک بار پھر عرض کریں گے کہ مقصد بڑا نیک ہے اور جو لوگ اس مقصد کے داعی ہیں۔ ان کی نیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن مقصد کا نیک ہونا اور نیتوں کا خلوص تو کامیابی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے سوچنا پڑے گا کہ کہیں بنیاد میں ہی تو کوئی خرابی موجود نہیں!

یہی وہ تلخ حقیقت ہے جس کے اظہار کے لئے ہم نے یہ تمہید باندھی ہے اور وہ حقیقتِ ثابتہ یہ ہے کہ **موجودہ مسلمان کا مسلمان ہونے کا دعویٰ** اس کے باہمی اخوت اتحاد کے لئے وجہِ اشتراک بننے میں ناکام ثابت ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی جو تحریکیں (مثلاً پان اسلام ازم) مسلمانوں کو (ان کے دعویٰ مسلمانی کی بنا پر) متحد کرنے کے لئے اٹھی تھیں، اپنے مقصد میں ناکام رہیں اور اب بھی اسی بنا پر جو سعی و کاوش بروئے کار لائی جائیگی خاسر و ناکام ثابت ہوگی۔

ہم اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ اگر موجودہ مسلمانوں کا محض مسلمان ہونا ان کے اتحاد کے لئے قدرِ مشترک بن سکنے کے قابل ہو سکتا، تو ان کے اتحاد کے لئے کسی تحریک کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ان کے مسلمان ہونے کا دعویٰ ان میں خود اتحاد پیدا کر دیتا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہم ان کے باہمی اتحاد کے لئے ان کے مسلمان ہونے کو قدرِ مشترک قرار نہیں دیتے اور ایسی مشترک اقدار تجویز کرتے ہیں جن کی بنا پر یہ آپس میں متحد ہو جائیں۔ مثلاً اقتصادی منفعت۔ یعنی ہم کہتے ہیں کہ اگر مسلمان ممالک تجارت کے معاملے میں باہمی اتحاد پیدا کر لیں تو انہیں بڑا اقتصادی فائدہ ہوگا۔ لیکن ذرا اس تجویز کا عملی پہلو سامنے لائیے اور دیکھئے کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے (مثلاً) آپ الف مسلمان ملک سے کہتے ہیں کہ وہ ب مسلمان ملک سے تجارتی معاہدہ کر لے تو اسے زیادہ فائدہ ہوگا۔ وہ آگے سے کہتا ہے کہ میں نے اس مسئلہ پر غور کر لیا ہے۔ میں اگر ہندوستان سے ایسا معاہدہ کروں تو مجھے زیادہ فائدہ ہوگا۔ فرمائیے! اس کے بعد آپ کا جواب کیا ہوگا؟ یہ بات محض ہم نے مثال کے طور پر لکھی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ وہ کون سی قدرِ مشترک تھی جس نے تمام مسلمانوں کو ــــ بغیر کسی جدید تحریک یا الگ قدرِ مشترک کے ــــ بھائی بھائی بنا دیا تھا اور جس کے کھو جانے

سے وہ، باوجود دعویٰ مسلمانی بھائی بھائی نہیں رہے۔ جب تک وہ قدرِ مشترک ان میں دوبارہ نہیں آتی، ان میں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے باہمی اخوت اور اتحاد پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ قدرِ مشترک، یہ بنائے حقیقی وہ قرآنی نظام تھا جس کے آئین و قوانین کا واحد سرچشمہ خدا کی آخری کتاب تھی۔ اسی بنا پر مسلمانوں سے کہا گیا کہ

واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرّقوا

حضور نبی اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ کے عہد میں مسلمانوں کی زندگی اعتصام بحبل اللہ کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ یعنی اُمت کی حیاتِ اجتماعی میں قرآن کا آئین اور قرآن کا قانون عملاً متشکل تھا۔ یہی نظام ان کے باہمی اتحاد و ائتلاف اور وحدت و اخوت کے لئے حقیقی وجہِ اشتراک تھا۔ جب تک یہ بنائے اشتراک زندہ اور قائم رہی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان تھا اور اس کا مسلمان ہونے کا دعویٰ ان کی اخوت کی بنیاد۔ آج مسلمان کو پھر اس بنائے اشتراک سے وابستہ کر دیجئے۔ یعنی خدا کی کتاب کو عملاً اس کا دستورِ حیات قرار دے دیجئے۔ اعتصام بحبل اللہ کا نقشہ از سرِ نو قائم ہو جائے گا۔ مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان قرار پا جائے گا۔ اس کے مسلمان ہونے کی دعوے کی عملاً تصدیق ہو جائیگی اور یاد رکھئے کہ اس طرح جب مسلمان حقیقتاً مسلمان بن گیا تو اسے اتحاد کی کسی اپیل کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس وقت اس کا مسلمان ہونا ہی اس کے لئے تقاضائے اتحاد قرار پا جائے گا۔ اس توحید کے اس کی زندگی میں عملاً متشکل ہو جانے سے وطن، رنگ، نسل اور فرقہ بندی کے سارے لات و منات زیر و زبر ہو کر رہ جائیں گے۔ خدا کی کتاب کو اپنے لئے ضابطۂ حیات اور اپنی مملکت کے لئے ضابطۂ قوانین بنا لینا اس کے اندر وہ تبدیلی پیدا کر دیگا جو اخوت و ائتلاف کا حقیقی جذبہ محرکہ ہوتی ہے۔

اقبالؒ نے کس قدر درست کہا تھا کہ

ہستیٔ مسلم ز آئین است و بس — باطن دینِ نبی این است و بس
تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست — زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست

اور وہ آئین ہے۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

اور نظامِ ملّی کے لئے یہی وہ اساسِ محکم تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس حکیم الامت نے کہا تھا کہ

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ اُو را اساسِ محکمے

تاریخ کے اوراق پر نگاہ ڈال کر دیکھ لیجئے کہ عرب و عجم میں جوں جوں اور جہاں جہاں مسلمانوں نے اس اساسِ محکم سے بیگانگی اختیار کی ان کے اتحاد و اخوت کی بنیادیں لرزتی اور پامال ہوتی چلی گئیں اور اب صدیوں سے وہ مسلمان ہونے کے دعوے کے باوجود کسی بنیاد پر متحد ہونے کے قابل نہیں ہو سکے۔ اب بھی موقع ہے کہ اقبالؒ کے الفاظ میں،

داستانِ کہنہ شُستی باب باب
فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

لہٰذا کرنے کا کام یہ نہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے نئی نئی اقدار مشترکہ وضع یا تلاش کریں۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم انہیں اس پر آمادہ کریں کہ وہ اپنی مملکت کے لئے قرآن کو ضابطۂ قوانین قرار دے لیں۔ ضابطۂ قوانین کی وحدت سے، مملکتوں میں خود بخود وحدت پیدا ہو جائے گی۔ یہ ہے کرنے کا کام ــــ اور اس کی ابتدا خود اپنے گھر سے کرنی چاہیئے۔

● قرآن چاہتا ہے کہ

اسے پڑھا جائے!

اُسے سمجھا جائے!

اس پر عمل کیا جائے!

اور ــــــــ اسکو دوسروں تک پہنچایا جائے!

علامہ حافظ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی

حقیقتِ حدیث

قرآنِ کریم پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم جس رسولِ امین پر اُترا، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم جس روح الامین کے توسط سے آتارا گیا، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور قرآنِ کریم کو جس معبود نے آتارا، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ نہ حدیث کے راوی پر ہمارا ایمان ہے، نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں، ان پر ہمارا ایمان ہے، نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایسی غیر ایمانی اور غیر یقینی چیز کو ہم قرآن کی طرح دینی حجت مانیں۔

حدیث کی صورت یہ ہے کہ زید نے کہا، میں نے سُنا عمرو سے، اُس نے سُنا تھا بکر سے، اس سے بیان کیا تھا خالد نے، اس سے کہا تھا اصغر نے، اس نے سنا تھا اکبر سے الخ۔ ایسا بیان روایت در روایت در روایت در روایت نہ علم ہے نہ شہادت اور نہ دنیا کی کسی عدالت کے نزدیک قابلِ سماعت ہے۔ پھر یہ حجت کیسے ہو سکتا ہے؟ ہاں ایک بات حدیث میں ہے، وہ یہ کہ اس کا سلسلہ آنحضرتؐ تک پہنچا دیا جاتا ہے اور یہی چیز ہے جس کی بدولت اس کی طرف توجہ کی جاتی ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں، لاکھوں حدیثیں راویوں نے اپنے اپنے خیالات اور اغراض کے ماتحت حضورؐ کی طرف منسوب کرنے میں وضع اور کذب سے کام لیا ہے، تو اس کی نسبت کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ ہر ایک روایت کے آخری راوی سے ثبوت طلب کیا جاتا کہ تم نے جو فلاں سے اس کو سُنا ہے، اس کے دو گواہ عادل پیش کرو جو شہادت دیں کہ ہمارے سامنے اس نے یہ روایت کی۔ پھر اسی طرح سلسلہ کے ہر ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ آخر تک ہوتے، تو بھی روایت کا کچھ اعتماد قائم ہوتا مگر یہاں تو نہ کوئی ثبوت ہے نہ شہادت ہے۔ ہر راوی جو کچھ بیان کرتا ہے وہ خود ہی مدعی ہے اور خود ہی گواہ ہے اور خود ہی ثبوت ہے[1]۔ یعنی کسی بات کو آنحضرتؐ کی طرف بسلسلۂ روایت در روایت منسوب کر دینا اسی کا نام حدیث ہے، لہٰذا اجملہ

---

[1] اگر کوئی روایت متعدد طُرق سے مروی ہے، تو ہر ایک طریق اسی طرح بے دلیل ہے اور ثبوت کا محتاج۔

روایات کسی قسم کے ثبوت سے عاری ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کہا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو رواۃ ہیں وہ معتبر ہیں لیکن یہ اعتبار کس بنیاد پر قائم ہوا ہے؟ صرف ان کے ہم عصروں کے بیانات پر۔ یہ بیانات خود حجت نہیں، اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں باہم دگر سخت اختلافات ہیں اور ہزاروں ہیں، جن کو اگر ایک سچا سمجھتا ہے، تو دوسرا جھوٹا۔ ائمہ نے رواۃ کی جو توثیق کی ہے وہ صرف عرفِ عام کے مطابق ہے نہ کہ حقیقت کے۔ ایسی ظنی اور تخمینی ثقاہت تاریخ میں تو کچھ کارآمد ہو سکتی ہے، لیکن دین میں اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا دارومدار علم و یقین پر ہے۔ قرآن میں تصریح ہے:

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل/۳۶)

اس کے پیچھے نہ چل، جس کا تجھ کو یقین نہیں ہے۔

حدیثیں دین کیونکر بنیں؟ قرآنِ کریم اسلام کی مستقل اور کامل کتاب ہے، جس میں اللہ نے اپنے دین کو مکمل کر دیا ہے اور جس کی حفاظت ہمیشہ کے لئے اپنے ذمہ لی۔ یہی کتاب عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ میں ملّتِ اسلامیہ کا دستور العمل رہی، لیکن جب بنی امیہ کا زمانہ آیا، تو وہ حکومتِ الٰہیہ جو رسول اللہ نے قائم کی تھی، انسانی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔ ان نام نہاد خلفاء نے (بجز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے) اپنا ذاتی تسلط ملّت پر جمایا اور خزانہ اور ملک پر قبضہ کر کے فوج کو اپنے قابو میں کیا اور اس کی قوت سے آزاد مسلمانوں کو جو صرف اکیلے اللہ کے حکم کے مطیع تھے، اپنی رعایا اور غلام بنا لیا اور ان کی دینی قیادت اور راہنمائی جو خلیفۂ اسلام کا اوّلین فریضہ تھی، علماء کے ذمہ چھوڑ دی۔ اس وقت سے سیاست اور دین دو الگ الگ چیزیں ہو گئیں۔ سیاست کا مرکز تو یہی خلفاء رہے اور دین لامرکزی صورت میں علماء کے ہاتھ میں آ گیا۔ ان کے اجتہادات اور استنباطات میں اختلافات کا پڑنا لازمی تھا، جن کے فیصلے کے لئے کسی مرکز کی ضرورت تھی۔ اس لئے رسول اللہ کی ذات مرکز بنائی گئی ہے اور ہر مسئلہ اور ہر اجتہاد کے لئے روایت کا سلسلہ نکالا گیا۔ بنی امیہ کے عہد میں چونکہ سادہ عربی زندگی تھی، اس لئے روایات کا ذخیرہ زیادہ نہیں ہوا، لیکن بنی عباس کے زمانہ میں جب مختلف علوم و فنون کے ترجمے کئے گئے اور متعدد عجمی اقوام سے اختلاط ہوا اور خیالات، افکار اور دینی مسائل میں بہت وسعت پیدا ہو گئی، اس وقت روایت نے باقاعدہ ایک فن کی صورت اختیار کر لی اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے یہی پیشہ اختیار کر لیا اور چونکہ روایت کشی کے لئے کسی لیاقت یا معیارِ علم کی شرط نہ تھی، اس لئے ہر شخص جس میں ذرا بھی تدین ہوتا، اس میں حصہ لے کر دینی عزت اور دنیاوی بزرگی حاصل کرنے لگا اور روایت ایک عام مشغلہ ہو گئی اور ہر شہر میں رواۃ کی تعداد کی کوئی حد نہ رہی۔

قرآن کو خلفاء بنی امیہ (بجز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ) اور خلفائے بنی عباس نے جو دراصل مستبد سلاطین تھے، سیاست سے پہلے ہی متروک کر دیا تھا۔ اب ان راویوں نے دینی حیثیت سے روایتوں کے اندر اس کو دفن کر دیا اور اس کی تشریح و تفسیر بھی انہیں سے ہونے لگی اور حدیث کا تسلط اس قدر بڑھ گیا کہ امام اوزاعی متوفی ۱۵۷ھ نے فرمایا کہ قرآن اس سے

زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے، جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں"۔ اور امام یحییٰ بن کثیر نے کہا کہ "حدیث قرآن پر قاضی ہے قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے"۔

حدیثوں کے ذریعہ سے قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام، مقید کو مطلق اور مطلق کو مقید، بلکہ اس پر اضافے کرنے لگے۔ نیز بعض ائمہ فقہ نے روایات سے آیات کو اصولاً منسوخ کرنے کا فتویٰ دے دیا اور اس طرح قرآن کے استقلال کو مٹا کر اس کو حدیثوں کے ماتحت بنا دیا، جن کی بدولت دین میں سینکڑوں باتیں ایسی داخل ہو گئیں، جن کا قرآن میں نام و نشان بھی نہیں ہے۔

موضوعات

حدیث نے جب فن کی صورت اختیار کر لی اور روایات دین قرار پا گئیں، تو ان میں وضع اور کذب نے راہ پائی اور ہزاروں پیشہ ور کذاب پیدا ہو گئے جن کا رات دن یہی کام تھا کہ حدیثیں گھڑیں۔ ائمہ حدیث نے جب تنقید کی طرف توجہ کی، تو ان کو موضوعات کا ایک انبار ملا۔ ملا علی قاری نے اپنی کتاب "موضوعاتِ کبیر" میں لکھا کہ "زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں"۔ شیخ محمد طاہر گجراتی اپنی کتاب "تذکرۃ الموضوعات" میں لکھتے ہیں کہ جوئباری، ابنِ عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار حدیثیں بنائیں۔ ابن ابی العوجاء زندیق کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب وہ پکڑا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں، جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتا رہا ہوں۔ وضاعین کی سب سے پہلی فہرست امام عبداللہ برقی متوفی ۲۴۹ھ نے تیار کی۔ اس کے بعد دیگر ائمہ جرح و تعدیل نے اس میں کتابیں لکھیں، جن میں سے چند یہ ہیں:۔

کتاب الضعفاء[1]	امام بخاریؒ متوفی ۲۵۶ھ
"	ابواسحٰق جوزجانی متوفی ۲۵۹ھ
"	ابوجعفر عقیلی متوفی ۳۲۳ھ
"	ابونعیم استرآبادی متوفی ۳۲۳ھ
"	ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ (یہ کتاب کامل کے نام سے مشہور اور بارہ جلدوں میں ہے)

یہ سوچنے کی بات ہے کہ آنحضرتؐ کی ذات ایک تھی اور حدیثیں بھی جو آپؐ کے نام سے روایت کی گئی ہیں، ان کا ۹۹ فی صدی حصہ مدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس کی مدت دس سال ہے اور ادھر وضاعین کی اتنی بڑی جماعت ہو گئی جن کے تراجم بارہ بارہ جلدوں میں لکھے جانے لگے اور صدیوں کا زمانہ ان کو مل گیا جس میں ان کے اوپر نہ کوئی پابندی تھی نہ کسی قسم کی گرفت، بلکہ عوام میں مقبولیت، شہرت، عظمت اور بزرگی حاصل ہوتی تھی۔ پھر انہوں نے جس قدر حدیثیں وضع کی ہوں گی، ان کو سوائے علام الغیوب کے کون شمار کر سکتا ہے؟

---

[1] ضعفاء کا لفظ ائمہ نے ازراہِ احتیاط اختیار کیا ہے کہ شاید ان میں کوئی سچا ہو ورنہ مراد کذابین ہیں۔

ائمہ حدیث نے وضع حدیث کے مختلف اغراض اور اسباب بھی بیان کئے ہیں مثلاً

۱۔ بنی امیہ کے عہد میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر منبروں سے لعنت بھیجنے کا دستور نکالا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں امیر معاویہؓ کے مناقب اور حضرت علیؓ کے مثالب میں حدیثیں بنائی گئیں۔ اسی عہد میں روایتوں کے ذریعہ سے ایمانیات

میں "تقدیر" کا اضافہ کیا گیا۔ قرآن میں تو ایمان کے صرف پانچ اجزا بتائے گئے ہیں۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ............................... وَالنَّبِيِّيْنَ (۲/۱۷۷)

لیکن نیکی (کرنے والا) وہ ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخر پر اور ملائکہ پر اور کتاب پر اور انبیاء پر۔

دوسری آیت میں ہے؛

وَمَنْ يَّكْفُرْ............................... ضَلٰلًا بَعِيْدًا (۴/۱۳۶)

اور جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یومِ آخر کا انکار کیا وہ دُور کی گمراہی میں پڑ گیا۔

لیکن اس میں چھٹا جزو "القدر خیرہ و شرہ کلہ من اللہ" بھی بڑھایا جو آج تک بدستور چلا جاتا ہے، حالانکہ قرآن کریم نے تقدیر کو دین کی ایک حقیقت بتایا ہے، اس کو ایمانیات میں نہیں داخل کیا ہے۔

۲۔ ردِ عمل کے طور پر بنی عباس کے دعاۃ نے ہزاروں حدیثیں بنی اُمیہ کے معائب اور اقربا رسول کے فضائل و استحقاقِ خلافت میں بنا کر مغرب سے مشرق تک پھیلا دیں۔

۳۔ تختِ خلافت پر آ جانے کے بعد عباسیوں نے اپنی حکومت کو دینی رنگ دینا چاہا، اس وجہ سے ان کے ایک ایک خلیفہ کی پیشین گوئی اور فضیلت میں روایات بنائی گئیں۔ ابوالفرج اصفہانی مطیع بن ایاس کے حالات میں لکھتا ہے کہ خلیفہ مہدی اس کا بڑا قدردان تھا کیونکہ وہ اس کی مہدویت کے بارے میں حدیثیں بنایا کرتا تھا[1]۔

۴۔ اہلِ بیت کے خلافت سے محروم ہو جانے کے بعد شیعہ ان کی امامت نیز ان میں سے ایک مہدی کے آنے کی بشارت کی روایتیں امت کو سناتے تھے اور اپنے ائمہ کی عصمت و عظمت اور ان کی محبت اور ولا کو جزوِ ایمان اور نجات کا ذریعہ ثابت کرنے کے لئے حدیثیں تراشتے تھے[2] اور یہ سب کچھ محض ان کی نسبی خصوصیت کی بنا پر تھا، حالانکہ

---

[1] رنات المثالث والمثانی فی روایات الآغانی جلد ا ص ۲۹۷ — [2] شیعہ کے نزدیک ہر وہ بات جو ان کے کسی امام موصوف کی طرف منسوب ہو، حدیث ہے، اس لئے ان کے یہاں روایات میں بہت وسعت ہو گئی اور اسی نسبت سے موضوعات میں بھی۔

قرآن کی رُو سے انسان کی قسمت کا معیار اس کے عقائد و اعمال ہیں۔ نسب کی بنیاد پر کسی کو کوئی حق وہ نہیں دیتا بلکہ اس کو صرف تعارف کا ذریعہ اور جیتے جی کا رشتہ بتلاتا ہے:

فَاِذَا نُفِخَ ..... يَتَسَآءَلُوْنَ۔ (۲۳/۱۰۱)

پھر جب صور پھونک دیا گیا، تو نہ اس دن ان میں رشتے ہوں گے اور نہ آپس میں پوچھ گچھ کرینگے۔

اور قیامت کے دن مطلق کارآمد نہیں۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ ..... يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۳/۳)

ہرگز تم کو نفع نہیں پہنچائیں گے تمہارے رشتے اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن۔

۵۔ قصاص، مذکر اور واعظ طرح طرح کے قصے، افسانے اور روایتیں آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کر کے اپنے قصص، اذکار اور مواعظ کو دلچسپ اور بااثر بناتے تھے۔

۶۔ زندیقوں یعنی ان عجمیوں نے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے مگر در پردہ اسلام کو مٹانے کی فکر میں تھے۔ ایسی ایسی حدیثیں گھڑیں، جو شریعت کو فنا کر دینے والی تھیں۔

۷۔ مختلف فرقے جو اسلام میں پیدا ہو گئے تھے، ان میں سے اکثر اپنی تائید اور اپنے مخالفوں کی تردید میں حدیثیں گھڑتے تھے۔

۸۔ بعض لوگ جو متدین اور محترم سمجھے جاتے تھے، اعمال و اذکار کی ترغیب و ترہیب میں روایتیں وضع کرتے تھے، چنانچہ نوح بن مریم نے قرآن کے ایک ایک سورۃ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں۔ جب لوگوں نے تحقیق کی اور اس کے پاس پہنچے، تو اس نے بے تکلف اقرار کر لیا کہ یہ روایتیں میں نے بنائی ہیں تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلتیں اور بمقابلہ دیگر انبیاء کے جو خصوصیتیں ہیں، ان کو قرآن نے مفصل بیان کر دیا ہے یعنی:

(۱) دیگر انبیاء قبائلی یا قومی ہوتے تھے مگر آپؐ جملہ بنی نوع انسان کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے۔

(۲) انبیاء سابقین کے اوپر جو کتابیں یا صحیفے نازل کئے گئے، وہ سب فنا ہو گئے۔ آج توریت، زبور اور انجیل کے بھی صرف ترجمے ہیں اور اصل مرفوع۔ لیکن آپؐ کے اوپر جو کتاب نازل ہوئی، اس کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے اور ہمیشہ کے لئے اس کو محفوظ کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

(۳) آپؐ کے اوپر نبوت ختم کر دی گئی اور قیامت تک کے لئے یہی نبوت قائم رکھی گئی۔

(۴) معراج میں انسانی کمال کی آخری حد اور علوم نبوت کے افقِ اعلیٰ پر پہنچا کر آپؐ کو اللہ نے جملہ انبیاء کی وراثت اور نبوتِ کبریٰ سے سرفراز فرمایا۔

ان کے علاوہ بھی جابجا آیات میں آپؐ کے صفات اور فضائل کا ذکر ہے اور قرآن نے ان کے بیان کرنے میں کمی نہیں کی ہے، مگر باوجود ان کے رسول پرستی کے جذبہ میں آپؐ کے مدائح اور صفات میں ہزارہا روایتیں گھڑی گئیں، جن میں سے خود محدثین نے بیشتر کو موضوع قرار دیا۔

یہی حال معجزات کا ہے۔ قرآن نے تصریح کے ساتھ کہا کہ خاتم النبیین کو عقلی معجزہ قرآن کریم دیا گیا جس کو اہلِ بصیرت قیامت تک دیکھ سکتے ہیں، نہ کہ دیگر انبیاء کی طرح حسّی معجزہ[1]۔

وَ اِذَا لَمْ ..... مِنْ رَّبِّكُمْ (۷/۲۰۳)

اور جب تو ان کے پاس کوئی نشان نہیں لایا، تو انہوں نے کہا کہ کیوں نہ تو نے کوئی نشانی چن لی۔ کہہ دے کہ میں تو اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کے یہاں سے وحی مجھ پر آتی ہے۔ یہی تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔

یہی بات دوسری آیت میں مزید تصریح کے ساتھ ہے۔

وَ قَالُوْا لَوْلَا ..... يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱-۵۰)

اور کافروں نے کہا کہ کیوں نہ اس کے اوپر کوئی نشانی اتاری گئی۔ کہہ دے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں، میں تو کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں۔ کیا ان کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم نے تیرے اوپر کتاب اتار دی ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

یعنی جس نشانی یا معجزہ کے وہ طلب گار ہیں، اگر ان کے پاس بصیرت ہو، تو اس کے لئے قرآن کافی ہے۔

آنحضرتؐ کی خواہش تھی کہ کوئی نشانی جیسی کہ یہ منکرین طلب کرتے ہیں، مل جاتی، تو میں ان کو قائل کے مسلمان بنا لیتا۔ اس پر سورۃ انعام میں اللہ تعالیٰ کسی قدر عتاب کے ساتھ فرماتا ہے:۔

وَ اِنْ كَانَ ..... مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۶/۳۵)

اگر تیرے اوپر ان کی روگردانی گراں گزرتی ہے، تو اگر تجھ سے ہو سکے، تو زمین میں کوئی سوراخ تلاش کر یا آسمان پر سیڑھی لگا اور ان کے لئے نشانی لا۔ اللہ اگر چاہتا، تو سب کو سیدھے راستے پر لگا دیتا۔ تو جاہلوں میں سے نہ بن۔

اور سورۂ بنی اسرائیل میں حسّی معجزات نہ دینے کی وجہ بھی بیان کر دی۔

وَمَا مَنَعَنَآ ..... بِهَا الْاَوَّلُوْنَ۔ (۱۷/۵۹)

ہم کو نشانیاں بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ پہلے لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں۔

---

[1] ان باتوں کی تفصیل ہماری کتاب 'تعلیماتِ قرآن' میں ملاحظہ فرمائیں۔

گذشتہ قوموں نے معجزات طلب کئے۔ پھر ان کو دیکھ لینے کے بعد جادو اور نظر بندی کہہ کر جھٹلایا، اس لئے اتمامِ حجت کے بعد ان کا ہلاک کرنا لازم آگیا، لیکن رحمۃ للعالمینؐ کا دور عقل و بصیرت کا دور ہے، جس میں انسان کو خود حقیقت کو سمجھ کر ایمان لانا چاہیئے۔

وَ قُلِ الْحَقُّ ..... فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸/۲۹)

اور کہہ دے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا، جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر بنے۔

مگر ان صریح آیات کے ہوتے ہوئے بھی راویوں نے آنحضرتؐ کے حسّی معجزات کی روایات کا انبار لگا دیا[۲]۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے امت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اولیاء کی کرامات پر بھی ایمان رکھو۔

۱۰۔ مناقبِ صحابہ میں جس قدر روایتیں ہیں، ان میں سے اکثر کو محدثوں نے موضوعات کی فہرست میں داخل کیا ہے۔ دراصل صحابہ کرام کی فضیلت کے لئے وہی آیتیں دینی لحاظ سے کافی ہیں جو مہاجرین و انصار کی مدح میں قرآن میں ہیں اور تاریخی لحاظ سے ان کے کارنامے ان کی عظمت کے شاہد ہیں۔ ان کی برتری اور بزرگی کے لئے روایات کی ضرورت ہی نہیں۔

۱۱۔ علماء اور متعلمین کے فضائل میں جس قدر روائتیں، خود ساختہ ہیں۔

۱۲۔ شخصیت پرستی آجانے کی وجہ سے اشخاص نیز مقامات کی فضیلتوں میں حدیثیں وضع کی گئیں۔

۱۳۔ آنحضرت کے غزوات، پیش گوئیوں نیز آیات کی تفسیر میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں حدیثیں روایت کی گئیں، جن کی نسبت امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ ان کی کوئی اصلیت نہیں[۱]

۱۴۔ تصوف جب مسلمانوں میں آیا، تو بہت سی متصوفانہ روائتیں بنائی گئیں جو موضوعات جمع کرنے والے محدثوں کے حصہ میں آئیں۔

الغرض کذب کے بہت سے اسباب تھے اور بہت سی راہیں۔ ہر ہر شعبہ میں بے شمار روایتیں گھڑی گئیں اور ایک ایک سیج میں سو سو جھوٹ ملایا گیا۔ لاریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اقوال کے متعلق کچھ صحیح حدیثیں بھی ضرور تھیں لیکن اس جھوٹ کے سیلاب سے جو مختلف راستوں سے آیا، سچائی کے ان قطروں کو یقین کے ساتھ چن لینا انسانوں کے لئے بالکل ناممکن ہوگیا۔ کیا کذب اور وضع سے بڑھ کر دینِ الٰہی کو مذاق بنانے کی اور کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ قرآن میں ہے،

وَمِنَ النَّاسِ ..... هُزُوًا۔ (۳۱/۶)

اور بعض لوگ وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ بلا یقین کے اللہ کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کریں اور اس (اللہ کی راہ) کو مذاق بنالیں۔

---

[۱] تذکرۃ الموضوعات ص ۸۲۔ [۲] ان روایات کا جس کو شوق ہو وہ مولانا کرامت علی موسوی دہلوی کی تالیف السیرۃ المحمدیہ کی جسمیں عجیب و غریب ہزارہا معجزات جمع کئے گئے ہیں، یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ مدت ہوئی بمبئی میں بڑی تقطیع میں باریک خطمیں ساڑھے چھ سو صفحات پر طبع ہوئی تھی۔

دو قسم کے شیاطین ہر نبی کی عداوت کے لئے دو قسم کے شیاطین (کذابین) ہوتے ہیں جن کی تفصیل قرآنِ کریم میں بیان کی گئی ہے۔

۱۔ پہلی قسم وہ ہے جو نبی کے اوپر اُتری ہوئی آیات میں اضافے کر کے ان کو مسخ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان اضافوں سے اپنی آیات کو محفوظ کر کے محکم کر دینے کا ذمہ اللہ نے خود لیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا.............. یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ (۲۲/۵۲)

ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ جس وقت اس نے تلاوت کی تو شیطان نے اس کی تلاوت میں (اپنے الفاظ) ڈال دیئے۔ پھر اللہ شیطان کی ڈالی ہوئی باتوں کو نکال کر اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔

اس لئے [illegible] منیق" اور اسی قسم کی قرأت شاذہ کی روایتیں جن سے اللہ نے اپنی آیات کو پاک کر کے محکم کر دیا ہے، [illegible]بلِ قبول بلکہ ناقابلِ سماعت ہیں۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جو دین میں جھوٹی روایتیں گھڑتی ہے اور افترا کرتے ہوئے نہ عاقبت سے ڈرتی ہے نہ اللہ سے [illegible]ہے مفتریوں کی سزا نامرادی ہے۔" وقد خاب من افترٰی" یہودیوں نے جھوٹی روایتیں گھڑی تھیں۔ اللہ [illegible]ے میں فرمایا:

وَغَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ (۳/۲۴)

اور دین میں ان کو دھوکا دیا ان باتوں نے جن کو وہ گھڑتے تھے۔

محدثین کی اس جماعت کو چھوڑ کر جنہوں نے سچائی کی جستجو کی، وضاعین اور کذابین ان آیات کے تحت میں آتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ.............. یَخْرُصُوْنَ۔ (۶/۱۱۲—۱۱۷)

اور ایسا ہی ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے، انسی اور جنی شیاطین جو ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی فریب دینے والی باتیں سکھاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا، تو وہ ایسا نہ کرتے۔ سو تو ان کو اور ان کی گھڑی ہوئی باتوں کو چھوڑ دے اور وہ اس لئے (کرتے ہیں) تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اس کو پسند کریں اور وہی کریں جو وہ کر رہے ہیں۔ (تو یہی کہتا رہ) کہ کیا اللہ کے سوا میں اور کسی کو منصف مانوں، حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتار دی ہے اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اُتری ہے۔ لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور تیرے رب کی باتیں سچائی اور عدل کی رُو سے پوری ہیں، کوئی اس کے الفاظ کو بدلنے والا نہیں ہے، وہ سمیع و علیم ہے

اور اگر قوبات ماننے گا اکثر لوگوں کی جو دنیا میں ہیں، تو وہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے، وہ تو صرف گمان پر چلتے ہیں اور محض اٹکل دوڑاتے ہیں۔

ان آیات کی تشریح کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے مگر باتیں بالکل واضح ہیں؛

۱۔ ہر نبی کے دین میں وضاعین اور کذابین روایتیں گھڑتے اور پھیلاتے ہیں۔

۲۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ ان ہی جیسے عقبیٰ سے بے خوف لوگ ان کی باتیں مانیں اور وہی کرنے لگیں جو وہ کر رہے ہیں۔

۳۔ مومن کو حکم ہے کہ ان کو اور ان کی گھڑی ہوئی روایتوں کو بھی چھوڑ دے اور یہی کہے کہ اللہ کے سوا میں کسی کو حکم نہیں مانتا، اس نے مفصل کتاب اتار دی ہے (جو کافی ہے)۔

۴۔ اللہ کی اطاعت کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت میں گمراہی کا ڈر ہے، کیونکہ اکثر لوگ ظنی اور تخمینی باتوں کو دین بنائے ہوئے ہیں۔

یہ اللہ کی اطاعت، رسول اور اس کے بعد اس کے خلفاء کے ذریعہ سے ہوگی جو امت کو قرآن کے مطابق چلائیں گے۔ یہ نہیں کہ ظنی روایات کے انبار میں سے ہر ہر فرقہ اپنے اپنے خیالات کے مطابق صحیح حدیثیں چن چن کر ان پر عمل کرے اور رسول کی اطاعت کا دم بھرے۔

رفتارِ حدیث

عہدِ صحابہ میں حدیثیں بہت کم تھیں۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم روایت اور کتابتِ حدیث دونوں سے منع فرماتے تھے۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، حدیثیں بڑھتی گئیں اور چونکہ ان میں وضع اور کذب نے راہ پائی تھی، اس وجہ سے اربابِ بصیرت اور اہلِ تقویٰ ان کے قبول کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔

امامِ اعظمؒ

ائمہ فقہ میں سب سے پہلے امام، جن کی امامت آج تک مسلّم چلی آتی ہے، ابوحنیفہؒ متوفی ۱۵۰ھ ہیں۔ انہوں نے حدیثوں کی قبولیت کے لئے بہت سخت شرطیں رکھی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی کہ راوی فقیہہ ہو تاکہ روایت کا موقع، محل، غرض اور مفہوم سمجھنے میں غلطی نہ کرے، اس وجہ سے وہ اخبار احاد میں سے ایسی روایتوں کو بھی جو قیاس صحیح کے خلاف معلوم ہوتیں، قبول نہیں کرتے تھے۔ مثلاً قرعہ اندازی کو وہ اصولاً قمار بازی خیال کرتے تھے پھر اس حدیث کو کیسے صحیح تسلیم کر لیتے کہ "آنحضرتؐ جب کسی سفر میں جاتے تو ازواجِ مطہرات میں قرعہ ڈالتے، جس کا نام نکلتا اس کو ساتھ لے جاتے۔" اسی طرح ان کے نزدیک مالِ غنیمت میں سے سوار کا حصہ پیادہ سے دگنا تھا۔ کسی نے کہا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ "گھوڑے کے دو حصے ہیں اور سپاہی کا ایک۔" یعنی سوار کے تین حصے ہیں۔ جواب دیا "میں ایک چوپایہ کا حصہ ایک مومن سے ہرگز زیادہ نہیں سمجھتا۔" ان کا قول تھا کہ مبیع جب پختہ ہو چکی، تو فسخ کا اختیار بائع یا مشتری میں سے کسی ایک کو باقی نہیں رہا۔ کسی نے کہا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جب تک بائع اور مشتری ایک

دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں فسخ بیع کا اختیار باقی ہے۔ کہنے لگے کہ خواہ وہ دونوں ایک ہی جہاز میں ہوں یا ایک ہی قیدخانہ میں ہوں یا ایک ہی ساتھ سفر کر رہے ہوں؟ یعنی ایسی صورت میں مفارقت تو ہوگی نہیں، پھر بیع بھی پختہ نہ ہو سکے گی وہ قصاص میں (غالباً مثلہ کے قیاس پر) غیر فطری اور بے رحمی کے طریقے کو جائز نہیں رکھتے تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر دو پتھر میں کچل دیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سر بھی دو پتھروں میں کچلوا دیا۔ بولے یہ ہذیان ہے۔ ایک بار ایک شخص نے کوئی سوال کیا، انہوں نے جواب دے دیا۔ اس نے کہا کہ آنحضرتؐ سے فلاں روایت اس کے خلاف ہے۔ کہا، ہم کو ایسی روایتوں سے معاف رکھو۔ ابو اسحٰق فزاری نے ان کے سامنے ایک حدیث بیان کی، بولے کہ یہ حدیث خرافہ ہے۔ لوگوں نے اسی طرح کے کم و بیش دو سو فتاوے ان کے، حدیث کے خلاف گنائے ہیں۔ اسی وجہ سے اربابِ روایت ان سے خفا ہیں۔ چنانچہ امام بخاری نے بعض الناس کہہ کر ان کو ضعفاء میں شمار کیا ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہا کہ ہم نے اللہ کے مقابلہ میں ابوحنیفہؒ سے زیادہ جرأت کرنے والا نہیں دیکھا، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ وہ دراصل ان روایات کی نسبت کو رسول اللہؐ کی طرف صحیح نہیں سمجھتے تھے اور انہوں نے جو دقیق شرطیں حدیث کی صحت کے لئے رکھی تھیں، ان کے مطابق وہ نہیں اُترتی تھیں۔ امام شافعیؒ نے "کتاب الام" میں ان کے شاگردِ رشید امام ابویوسفؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "جو روایت قرآن کے خلاف پڑتی ہو، وہ رسولؐ کا فرمان ہو ہی نہیں سکتی، لہٰذا سنت (اسوۂ رسولؐ) کو معیار سمجھ کر انہیں پر روایتوں کو جانچا کرو۔" مکی نے بھی "مناقبِ ابوحنیفہؒ" ص۹۹ میں ان کا کیا ہے کہ "روایت کا ردّ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب نہیں ہے بلکہ اس کی تکذیب ہے جو غلط بات کو آنحضرتؐ کی طرف منسوب کرتا ہے، ورنہ آپؐ کا فرمان سر اور آنکھوں پر۔ اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہ بھی ہمارا ایمان ہے کہ آپؐ نے کوئی حکم ایسا نہیں دیا جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو اور نہ کوئی بدعت یعنی نئی بات اپنی طرف سے کہی۔"[1]

مؤطا

امام اعظمؒ کے بعد ہی امام مالکؒ کا زمانہ ہے بلکہ ان دونوں اماموں کو ہم عصر سمجھنا چاہیئے۔ امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں وفات پا گئے اور امام مالکؒ کی پیدائش ۹۳ھ میں ہوئی۔ ان کی کتاب مؤطا خیرالقرون کے عمل متواتر کا جملہ دینی کتابوں سے زیادہ اعتماد کے قابل مجموعہ ہے کیونکہ مدینہ منورہ عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ میں اسلام کا مرکز رہا۔ اس میں علماءِ تاریخ کے اندازہ کے مطابق کم و بیش بارہ ہزار صحابہ تھے، جن میں سے تقریباً دس ہزار وہیں رہے اور وہیں فوت ہوئے، بقیہ دو ہزار دیار و امصار یعنی عراق و مصر اور شام و یمن وغیرہ میں پھیلے۔ اس لئے شریعت کا اصلی اور صحیح ذخیرہ مدینہ ہی میں ہو سکتا تھا، یہ خوبیٔ اتفاق ہے کہ آج ہمارے ہاتھوں میں جس قدر دینی کتابیں ہیں، ان میں سب سے پہلی کتاب جو مدوّن ہوئی، وہ مدینہ میں ہوئی، یعنی یہی مؤطا۔ اس کتاب میں اہلِ مدینہ کے پاس اسوۂ

---

[1] ضحی الاسلام جلد ۲ صفحہ ۱۹۳-۱۹۵۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ امامِ اعظمؒ کی مثال کو میں نے عدمِ حجیتِ حدیث کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ غالباً وہ حدیثوں کو اپنے شرائط کے مطابق حجت مانتے تھے۔ میرا استدلال تو قرآنِ کریم سے ہے۔

رسولؐ و خلفاء راشدین و صحابہ کرام و تابعین عظام کا جو کچھ سرمایہ تھا اور جس قدر مسائل اور فتاوے ان کے معمول بہ تھے وہ سب جمع کر دیئے گئے ہیں۔

شارحین کے مطابق امام موصوف نے اپنی وفات سے چالیس سال پہلے اس کو مرتب کیا تھا۔ ان کی وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی، اس وجہ سے اس کی تالیف کا زمانہ ۱۴۰ھ سمجھنا چاہیئے۔ یہ کتاب چالیس سال تک ان کے ہاتھوں میں رہی اور اسی کا درس وہ اپنے شاگردوں کو دیتے رہے۔ اس کی شرح زرقانی کے مقدمہ میں ہے کہ جب امام موصوف نے اس کو مدوّن کیا تھا، اس وقت اس میں چار ہزار حدیثیں تھیں، لیکن وہ سال بسال کانٹ چھانٹ کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کے انتقال کے وقت اس میں صرف ایک ہزار روایتیں رہ گئیں۔ اس تعداد میں مراسیل بھی شامل ہیں۔ متصل السند حدیثیں اس کے مختلف نسخوں میں صرف تین سو سے پانچ سو تک ہیں۔ معلوم نہیں کہ امام موصوف اور زندہ رہتے، تو اس تعداد میں بھی کس قدر کمی ہو جاتی، کیونکہ حدیثوں کو وہ ظنی ہی سمجھتے تھے اور ان کے متعلق یہ آیت پڑھا کرتے تھے[1]:

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (۴۵/۳۲)

ہم تو صرف گمان رکھتے ہیں، ہم کو یقین حاصل نہیں ہے۔

یہ ہے وہ کل ذخیرۂ حدیث و فقہ کا جو مرکزِ اسلام مدینہ منورہ کا سرمایہ ہے۔ یہ امت کے اسلاف کرام کا ترکہ ہے جو امام مالکؒ کی وساطت سے اس کو وراثت میں ملا ہے۔ بے شک امام ابنِ حزمؒ کے مطابق "اس میں بعض حدیثیں ضعیف بھی ہیں"۔ مثلاً رجم زانی کی روایت نیز اس کے بعض فقہی مسائل میں بھی اختلاف کی گنجائش ہے۔ لیکن قرآن سے سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

قانونِ عام

خلفاء بنی امیہ کے زمانہ میں چونکہ زندگی سادہ تھی اور مسائلِ شرعیہ میں علمی موشگافیاں نہیں ہوتی تھیں، اس وجہ سے سلطنت کے لئے عام قانون کی ضرورت کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوئی، مگر خلفاء عباسیہ نے اپنے تسلط پر دینی رنگ چڑھانے کی کوشش کی، اس لئے ان کی خواہش یہ ہوئی کہ ایک مرکزی قانون بنا لیا جائے جس پر سب لوگ چلیں۔ ابن المقفع نے خلیفہ منصور کے سامنے حکمرانی کے متعلق جو تجاویز پیش کی تھیں، ان میں بھی اس بات پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا تھا کہ اجماعی اور متفق علیہ نصوص کے مطابق ایک ایسا قانون بنا دیا جائے جس سے سب لوگ واقف ہوں۔ پھر زمانہ کی ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم و اصلاح ہوتی رہے۔ چنانچہ منصور نے امام مالکؒ سے درخواست کی کہ موطّا کو سلطنت کا قانونِ عام قرار دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ مختلف حصوں میں لوگوں کا عمل مختلف طریقوں پر رائج ہو چکا ہے۔ منصور نے کہا، کیا مضائقہ ہے ہم بزور ان کو اس کے اوپر چلائیں گے، مگر وہ راضی نہ ہوئے۔

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۱۳۔

شیخ محمد عبدہ مرحوم مفتی دیارِ مصریہ کے خیال میں امام مالکؒ کے انکار کی وجہ یہ تھی کہ خبرِ احاد حجت نہیں ہے، جس کی رُو سے کوئی بات کسی پر لازم کی جائے، وہ لکھتے ہیں[1]:

انما یحب العمل باحادیث الاحاد علی من وثق بھا ولکن لا یجعل تشریعا عامًا۔

اخبارِ احاد پر عمل اس کے لئے واجب ہے جو ان پر وثوق رکھتا ہو۔ وہ قانونِ عام نہیں بنائی جاسکتیں۔

اس ذیل میں صحیح بخاری کا ذکر بھی مناسب ہے جو علمِ حدیث کے انتہائی عروج کے زمانہ میں لکھی گئی۔

صحیح بخاری امام محمد بن اسمٰعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ کی مدوّن کی ہوئی ہے۔ یہ امام مالکؒ کی مؤطا کے ایک صدی بعد لکھی گئی جب کہ علمِ حدیث اپنے معراج پر پہنچ چکا تھا اور امام بخاریؒ کے اساتذہ میں سے امام احمد بن حنبلؒ دس لاکھ اور امام یحییٰ بن معین بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے۔ مقدمۂ صحیح بخاری میں ہے کہ امام بخاریؒ نے جب یہ کتاب لکھنی شروع کی، تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے ۷۲۷۵ حدیثوں کو اپنے شروط کے مطابق پایا، جن کو درج کیا۔ ان میں مکررات بھی شامل ہیں، اگر وہ نکال دی جائیں، تو حافظ ابن حجرؒ شارح بخاری کے بیان کے مطابق تعلیقات وغیرہ کو چھوڑ کر موصول مسند احادیث کی تعداد ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔

یہ خالص حدیث کی کتاب ہے۔ اس میں فقہ صرف اسی قدر ہے کہ اس کے ابواب کی ترتیب فقہی ہے۔ حدیث میں یہ سب سے چوٹی کی کتاب ہے جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کی گئی ہے اور اس کی جملہ روایات صحیح مانی گئی ہیں۔

لوگوں کا بیان ہے کہ امام بخاریؒ نے جن حدیثوں کو چھوڑ دیا وہ سب کی سب ضعیف یا غلط نہ تھیں، مگر جن کو انھوں نے چھوڑ دیا، ان کے متعلق بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم کو تو ان روایتوں کو دیکھنا ہے جو انہوں نے لی ہیں کہ کیا وہ سب کی سب صحیح ہیں؟

اس میں کچھ شک نہیں کہ امام بخاریؒ حدیث کے بلند پایہ امام تھے اور صحیح روایتوں کو لینے کے لئے جن جن لوازم اور شرائط کی فنِ رجال کی رُو سے ضرورت تھی، انہوں نے سب کا لحاظ رکھا، مگر باوجود ان سب کے چونکہ محدثین کا مدار صرف اسناد کی صحت پر رہ گیا تھا، اس لئے اس کتاب میں ایسی حدیثیں بھی آگئیں جو درایت کی رو سے صحت کے معیار پر نہیں اترتیں۔ مثلاً اس کے صرف ایک باب کتاب الانبیاء کو لے لیجئے، اس میں ہے کہ

۱۔ حضرت سلیمانؑ نے اس امید میں کہ ان کی ہر ہر بیوی ایک ایک مجاہد فرزند جنے گی، ایک رات میں اپنی نوے بیویوں پر گشت لگایا۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ نے ملک الموت کو جب وہ ان کی جان نکالنے آیا، ایسا تھپڑ مارا کہ واپس لوٹ گیا۔

---

[1] تفسیر القرآن جلد ۱ ص ۱۲۸۔

۳۔ اللہ نے حضرت آدمؑ کو ساٹھ گز کا پیدا کیا۔

یہ اور اسی قسم کی بعض دیگر روایتیں جو اس میں ملتی ہیں، اگر ان کو درائتاً دیکھا جائے اور عقل اور قرآن کی کسوٹی پر کسا جائے تو صحیح ثابت نہیں ہوتیں۔ پہلی روایت نہ صرف عقل بلکہ انسانی فطرت کے لحاظ سے ناممکن ہے۔

دوسری روایت قرآن سے معارض ہے جس نے عالمِ ملکوت کے ان محافظوں کو جو انسانوں پر متعین کئے جاتے ہیں، ملک الموت کہا ہے۔ سورۃ انعام میں ہے:

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (۶/۶۱)

اور اللہ تمہارے اوپر محافظوں کو بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے، تو (وہی) ہمارے فرستادے اس کی جان نکال لیتے ہیں۔

سورۂ سجدہ میں ہے:

قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ (۳۲/۱۱)

کہہ دے کہ موت کا وہ فرشتہ تمہاری جان نکالتا ہے تمہارے اوپر مقرر ہے۔

یہ غیر مادی موکل نہ تھپڑ مارے جا سکتے ہیں نہ تھپڑ کھا کر واپس لوٹنے والے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شانِ جلالی کو اس انداز میں دکھانے کی کوشش کی ہے، جیسے کوئی عامل کسی رئیس کے پاس وصولی کے لئے کسی پیادہ کو بھیجے اور وہ اپنے زعمِ ریاست میں تھپڑ مار کر اس کو بھگا دے حالانکہ انبیاء کا شیوہ رضا برضائے الٰہی ہے۔

تیسری روایت صحیح تاریخ کے خلاف ہے۔ چنانچہ خود صحیح بخاری کے بہترین شارح حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ "اقوام کے آثار سے جہاں تک پتہ لگ سکا ہے، انسان کا قد اتنا بڑا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے اب تک کوئی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے"[1]

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں تک اسناد کا تعلق ہے، امام بخاریؒ نے اپنے شروط کی مراعات میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی، کیونکہ وہ جرح و تعدیل کے مسلّم اور مستند امام ہیں، لیکن ان اسرائیلیات کے ان کی کتاب میں درج ہو جانے کے دو سبب ہو سکتے ہیں:۔

(۱) وضاعین اپنی روایتوں پر ثقہ راویوں کے نام چسپاں کر دیتے تھے اور یہ امر بہت مشتبہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا امام بھی اس قسم کی جملہ تدلیسوں سے باخبر تھا۔

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۲۶۰۔

(۲) خود فنِ رجال ظنی ہے، اس لئے اس کے اصول کی مراعات سے بھی روایات کی صحت کی ضمانت نہیں ہوسکتی جس کے چند وجوہ یہ ہیں:۔

(۱) اس فن میں رجال کے صدق و کذب کا مدار ان کے ہم عصروں کی شہادتوں پر رکھا گیا ہے، حالانکہ یہ ایسی باطنی صفتیں ہیں، جن کے اوپر سوائے ظنی اور تخمینی کے یقینی شہادت ہو ہی نہیں سکتی۔

(۲) یہ ہم عصروں کی شہادتیں بھی ہم خیالی، استادی، شاگردی اور دیگر عواطف و میلانات پر مبنی ہیں، چنانچہ سنی شیعہ راویوں اور شیعہ سنی راویوں کو من حیث الجماعت غیر معتبر سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے سے روایت نہیں لیتے۔

(۳) اس فن کی رو سے جو صادق قرار پاگیا اس کی ہر روایت سچی اور جو کاذب قرار پاگیا، اس کی ہر روایت جھوٹی سمجھی جاتی ہے اور یہ واقعیت کے خلاف ہے کیونکہ یہ کیا ضرور ہے کہ جس کو آپ سچا کہہ دیں وہ ہمیشہ سچ بولے اور جس کو جھوٹا کہہ دیں، اس کی ہر بات جھوٹی ہو، اس لئے یہ فن حقیقت سے بعید ہوگیا۔ ملا علی قاری کا یہ قول کہ

"یہ (حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آئی ہے، ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔" [1]

دراصل فنِ رجال پر صحیح تنقید ہے اور انہوں نے تسلیم کرلیا ہے کہ نہ صرف روایات بلکہ ان کے جانچنے کا معیار بھی ظنی ہے۔

ان ظنیات کو دینی حجت ماننے کی کوئی دلیل اس کے سوا نہیں ہے کہ

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ ۝ (۴۳/۲۲)

ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک راہ پر پایا اور ہم بھی انھیں کے نقوشِ قدم پر رستہ سے لگے ہوئے ہیں۔

اختلافات چونکہ جرح و تعدیل ظنی ہے اور روایات کی تصحیح اسی کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اس وجہ سے محدثین کی صحیح قرار دی ہوئی حدیثوں میں بھی بے حد اختلافات ہیں، جن سے مختلف فرقے اور خیال کے لوگ اپنے اپنے حسبِ منشا استدلال کرتے ہیں۔ ان میں باہم مطابقت پیدا کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، ان میں اس قدر تکلف ہے کہ مخالفوں سے تسلیم کرانا مشکل ہے اور بعض بعض تو اس قدر متضاد ہیں کہ ان میں تطبیق ہو ہی نہیں سکتی اور چونکہ فقہ کا مدار آیات سے زیادہ روایات پر ہے، اس وجہ سے اس میں بھی اس کے آثار نمایاں ہیں اور مسائل میں بیحد اختلافات ہوگئے ہیں۔

روایات کا یہ اختلاف دیار و امصار یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں ہے بلکہ ایک ہی مقام میں مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبدالوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں مکہ میں آیا، تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہا حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے میں امام ابوحنیفہؒ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی

---

[1] موضوعاتِ کبیر ص ۱۶۔

شرط لگائے تو کیا وہ جائز ہوگی ؟ جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابن ابی لیلیٰ سے جاکر یہی سوال کیا انہوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے ابن شبرمہ سے جاکر دریافت کیا، بولے بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہار ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں راویوں کا اس قدر اختلاف! اب دوبارہ میں ابو حنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سے یہ سب باتیں کہیں، فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں۔ مجھے تو حدیث ملی ہے ؛

حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال نھی رسول اللہؐ عن بیع و شرط۔ یعنی رسولؐ اللہ نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی۔

یہ سُنکر میں ابن ابی لیلیٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا انہوں نے کہا حدثنی ھشام عن عروہ عن ابیہ عن عائشۃؓ قالت امرنی رسول اللہ ان اشتری بریرۃ فاعتقھا فاشترط اھلھا الولاء لانفسھم فقال رسول اللہ ما کان من شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل۔ یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے رسولؐ اللہ نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کردوں اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ ولاء ان کی رہے گی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں، وہ باطل ہے۔

اب ابنِ شبرمہ کے پاس آیا۔ انہوں نے سب کچھ لینے کے بعد کہا کہ حدثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بعث النبی بعیرا د شرط لی حملانہ الی اھل المدینۃ۔ یعنی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری یہ شرط منظور کی گئی کہ اس پر لد کر مدینہ تک جاؤں گا۔

مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلاف پر ہی نہیں ہے بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماعی مرکز فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا، تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں پڑکر وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہوجاتی اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔

خاتمہ ان تمام بیانات کو جو حقائق پر مبنی ہیں، دیکھنے کے بعد ہر سوچنے اور سمجھنے والا شخص اس حتمی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ قرآن دین کی مستقل کتاب ہے اور اجتماعی اور انفرادی ہر لحاظ سے ہدایت کے لئے کافی ہے، وہ انسانی عقل کے سامنے ہر شعبۂ حیات میں اتنی روشنی رکھ دیتا ہے کہ وہ اس کے نور میں اللہ کی مرضی کے مطابق کام کرسکے۔ باقی رہی حدیث اور فقہ، سو حدیث کا صحیح مقام "دینی تاریخ" ہے اور فقہ کا "ہنگامی اجماع یا قیاس"۔

(طلوع اسلام دسمبر ۱۹۵۰ء سے ماخوذ)

علامہ غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمسّک بالکتاب

بلا کی کالی رات تھی۔ سامنے پہاڑ کی بٹیا سے دو آدمی نیچے اتر رہے تھے۔ ایک کے پاس روشنی تھی اور انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے شخص کو راستہ دکھانے کی غرض سے ساتھ ہے۔ دوسرے آدمی نے کہا۔ "بھائی! روشنی میرے آگے آگے رکھو تاکہ راستہ روشن ہو، پیچھے رکھنے سے تو اُلٹا خود میرے سایہ سے راستہ تاریک تر ہوتا چلا جارہا ہے"۔ پگڈنڈی بل کھاتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں نظر سے اوجھل ہوگئے۔ پھر وہی تاریکی اور سناٹا تھا۔ لیکن اس جانے والے کا فقرہ ابھی تک میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ روشنی کا مقصد یہ ہے کہ وہ تاریکیوں کے پردے کو چاک کرتی چلی جائے۔ لیکن یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ روشنی کو اس کے صحیح محل پر رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا میں اس قوم کو بھیجا جس کے متعلق خود فرمادیا:۔

آسمانی روشنی

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹)

تم بہترین قوم ہو جو نوعِ انسان کے فائدے کیلئے پیدا کی گئی ہے

تو انہیں ہلاکت اور تباہی کے عمیق غاروں سے بچانے کے لئے ایک مشعلِ ہدایت، ایک سراجِ منیر، ایک نورِ مبین عطا فرمایا کہ وہ اس کو اپنے جادۂ حیات میں پیش پیش رکھیں۔ اپنے شاہراہِ عمل کا خضرِ طریقت بنائیں۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں جو قدم اٹھائیں، اس کی روشنی میں اٹھائیں تاکہ وہ راستہ کی پُرخطر و مہیب گھاٹیوں سے مامون و مصئون منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

بِاِذْنِہٖ وَ یَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵/۱۵-۱۶)

اور تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور یعنی ایک کتاب مبین آئی ہے۔ اس کے ذریعے اللہ ایسے لوگوں کو جو قانونِ خداوندی کا اتباع کریں۔ سلامتی کی راہ بتاتا اور انہیں اس قانون کی رُو سے ظلمت سے نکال کر نُور کی طرف لاتا ہے اور انہیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

لیکن اگر وہ اس روشنی کو سامنے رکھنے کے بجائے (جس سے ان کا راستہ روشن ہو جائے) اپنے پیچھے رکھ چھوڑیں تو ظاہر ہے کہ قطع شدہ منزل تو ضرور درخشندہ و تابندہ نظر آئے گی۔ لیکن سامنے کا راستہ پہلے سے بھی تاریک ہو جائے گا۔ اس لئے کہ تنہا عقل کی دھندلی سی روشنی میں عام طور پر جس قدر راستہ نظر آسکتا ہے اس طرح وہ بھی انکے اپنے سائے سے ظلمت ناک ہو جائے گا یہی مطلب اس آیت مقدسہ کا ہے جس میں یہودیوں کے متعلق کہا گیا کہ انہوں نے اپنی کتاب کو پیٹھ کے پیچھے رکھ چھوڑا تھا تاکہ ان کا ماضی درخشندہ رہے لیکن مستقبل خوفناک طور پر تاریک ہو جائے۔

وَلَمَّا جَآءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۲/۱۰۱)

اور جب ان کے پاس من جانب اللہ وہ رسول آیا جو سچ کر کے دکھاتا ہے اسے جو ان کے پاس ہے تو اہلِ کتاب کے ایک فریق نے خود کتاب اللہ ہی کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا گویا انہیں کچھ علم ہی نہیں۔

یہود کا جُرم

یہود کا کیا جرم تھا؟ یہی کہ جب اُن سے کہا گیا کہ آؤ اس مقدس روشنی کو اپنا نصب العین حیات بناؤ جس سے تمہارا حال و مستقبل روشن ہو جائے اور تمہیں نظر آجائے کہ صحیح راستہ کونسا ہے، اور تمہاری کورانہ تقلید نے تمہیں کس راستے پر ڈال رکھا ہے تو انہوں نے اس روشنی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ جس ڈگر پر ہمارے آباؤ اجداد چلتے آئے ہیں وہی صراطِ مستقیم ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریق پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگرچہ انکے باپ دادا

نہ کچھ عقل رکھتے ہوں نہ ہدایت"

"یہی چیز ہے جسے اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفر سے تعبیر کیا ہے:۔

"جو شخص کفر کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جو ایسے (جانور) کے پیچھے چلا جا رہا ہو جو بجز بلانے اور پکارنے کے اور کسی بات کو نہیں سمجھتا (اسی طرح یہ لوگ بھی) بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں اور نہیں سمجھتے"۔ (۲:۱۷۱)

کفر و ناسپاسی اسی روش کا نام کہ جو چیز جس مصرف کے لئے دی گئی ہے اُسے اُس مصرف میں نہ لایا جائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال کا صحیح مقصد ہے کہ اسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے صرف کیا جائے۔ لیکن جو لوگ اس کے برعکس، اسے دبائے رکھتے ہیں انہیں قرآنِ کریم نے کفّار قرار دیا ہے۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ (۴:۳۷)

"یعنی وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخیلی کی تعلیم دیتے ہیں اور اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دے دی ہے۔ اور ہم نے ایسے کفّار کے لئے ذلّت آمیز عذاب مقرّر کر رکھا ہے"۔

یہی زندگی میں قرآنِ کریم کو اس کی صحیح جگہ پر نہ رکھنا۔ یعنی ہر معاملہ میں خالی الذہن ہو کر اس کی روشنی میں قدم نہ اٹھانا۔ قرآن کی زبان میں کفر ہے ایمان نہیں۔

کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈال دینا

اب سوال یہ ہے کہ کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈال دینے سے مطلب کیا ہے۔ آپ کو کوئی مسلمان ایسا نہیں ملیگا جو اس بات کا اعتراف کرے کہ اس نے قرآنِ کریم کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے یا اس کا قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ لیکن قرآن صرف اسی قدر اعتراف کو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک ایمان و ایقان کا ثبوت یہی ہے کہ انسان کے اعمال اس اعتراف کی شہادت دیتے ہوں۔ مثلاً دیکھئے اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ اگر تم خلافِ ارشادِ خداوندی ربوٰ میں الجھ گئے تو تمہارے لئے وہی جہنّم ہے جو کفّار کے لئے تیار کی گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۚ (۳/۱۲۹-۱۳۰)

اے ایمان والو! ربٰو مت کھاؤ - دونا - دوگنا کئے ہوئے اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ اور اس آگ سے ڈرو جو کفار کے لیے تیار کی گئی ہے ـــــــ

عام طور پر آپ کو دو قسم کی جماعتیں ملیں گی - ایک وہ لوگ جو دنیا میں صحیح اور غلط کا معیار اپنی مفاد پرستیوں ہی کو سمجھتے ہیں - ہر معاملہ کا اپنی مصلحت کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اور انہی فیصلوں کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں - چونکہ یہ لوگ اپنی عقل کا بے محل استعمال کرتے ہیں اس لئے انہیں ظالم کہا گیا اور ان کے متعلق ارشاد ہوا :-

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۳۰/۲۹)

لیکن ان ظالموں نے بلا علم و دلیل اپنی خواہشات (یعنی خیالات) کا اتباع کر رکھا ہے - سو جو (خدا کے قانون کے مطابق یوں) گمراہ ہو جائے اسے کون راہِ راست پر لا سکتا ہے - ان کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا -

چونکہ تنہا عقل کے فیصلے[1] یقینیات پر مبنی نہیں ہوتے - اس لئے قرآن کریم نے یقینی اور حقیقی علم، علم الکتاب کو کہا ہے اور جو علم الکتاب نہیں رکھتا - اس کے متعلق کہا کہ وہ محض قیاس آرائیاں کرتا ہے - وہ ذہنِ انسانی کی ابلہ فریبیوں سے طرح طرح کی منطقی موشگافیوں اور قسم قسم کی فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں کے حلقۂ دامِ فریب میں الجھا رہتا ہے اور عروسِ حقیقت اس کے سامنے کبھی بے نقاب نہیں ہوتی -

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ ۲:۷۸

اور ان میں سے اکثر ایسے بھی ہیں جو کتاب کا علم تو کچھ نہیں رکھتے سوائے اس کی لفظی تلاوت

---

[1] تنہا عقلِ انسانی راہنمائی کے لئے کیوں ناکافی اور ناقابلِ اعتبار ہے اس کی تفصیل اس موضوع سے خارج ہے اور ایک مستقل عنوان کی محتاج - اس وقت اس باب میں جوڈ کے بیان کا مختصر سا اقتباس پیش کرنا کافی ہو گا - لکھتا ہے "عقل فی الحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی یا انہیں بروئے کار لانے کا ایک آلہ ہے - اس کا کام یہ ہے کہ دن ان مقاصد کو ہمارے لئے مہیا کر دے جنہیں ہمارا نفس ہمارے لئے تجویز کر رہا ہے اور اس انداز سے کہ جو ہمارا نفس غیر شعوری طور پر کرنا چاہتا ہے اس کے جواز میں دلائل و حیل تراش دے - تفصیل ان امور کی "ابلیس و آدم" اور "انسان نے کیا سوچا؟" میں ملے گی -

کے۔ یہ لوگ محض قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔"

لیکن ظن حقیقت کے مقابلہ میں، کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۚ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۱۰:۳۶)

اور ان میں سے اکثر محض ظن کا اتباع کرتے ہیں۔ اور یقیناً ظن، حق کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا اور اللہ ان کے اعمال سے واقف ہے۔

دو قسم کی جماعتیں

یہ جماعت کبھی سعادت و نجات کی راہ نہیں پا سکتی کیونکہ انہوں نے اپنے خیالات ہی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے جس نے قرآن کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور یہ جماعت اس پہلی جماعت سے بھی زیادہ خطرناک وادیوں میں سرگرداں ہے۔ مقدم الذکر جماعت کی خطاء ولغزش کا راز ان کے کیریکٹر کی کمزوری ہے۔ قوتِ ایمان کا فقدان ہے۔ وہ رجحاناتِ ذہنی اور خواہشاتِ قلبی کے غلام ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان میں سے جو سلیم الطبع ہیں۔ جب ان کے سامنے قرآن کریم کا کھلا کھلا فیصلہ آجائے تو انکی نگاہیں ضرور جھک جائیں گی۔ قلب محسوس کرے گا اور انہیں نظر آجائے گا کہ جس راہِ عمل کو انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ انکی قلبی کمزوریوں کی وجہ سے ہے۔ قرآن کا راستہ وہ نہیں اور چونکہ ان میں عقل و بصیرت موجود ہوتی ہے۔ اس لئے جب ایک مرتبہ ان کے سامنے رشد و ہدایت کی راہیں کھل جائیں تو وہ اپنی روش کو دین بنا کر پیش نہیں کرتے۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ وہ ہیں جو غلط راستے پر چل رہے ہیں لیکن اسے عین صراطِ مستقیم سمجھ رہے ہیں۔ غلط مسلمات، غلط معتقدات۔ غلط نظریئے ذہن میں جما رکھتے ہیں اور انہیں دین کا نچوڑ قرار دیتے ہیں۔ وہ نمازوں میں اپنا رُخ قبلہ نما کو دیکھ کر سیدھا کرتے ہیں۔ لیکن ان کے قبلہ نما کا رُخ ہی کسی اور سمت کو ہوتا ہے۔ دینِ خداوندی کا اتباع نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہیں۔

اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱۸:۱۰۴)

جن کی کوششیں اس دنیا میں غلط راستے پر پڑی ہوئی ہیں اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں ؛ ؛

ان میں عوام کو تو چھوڑیئے جن میں ہنوز سمجھنے کی استعداد ہی نہیں ــــ اگرچہ کسی قوم میں جہالت کا ہونا کوئی معقول عذر یا فخر کی بات نہیں لیکن قیامت تو یہ ہے کہ جو لوگ عوام کے راہنما، علم و فضل کے مدعی،

رشد و ہدایت کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں۔ ان کی بھی یہ حالت ہے کہ ان کے علم و عمل کو قرآن سے کچھ نسبت نہیں ہوتی (الّا ماشاء اللہ) اس جماعت کا علاج اوّل الذکر جماعت سے کہیں دشوار تر اور کہیں دقت طلب ہے۔ اگر اوّل الذکر جماعت کو ان کے غلط راستے سے ہٹا کر سیدھی راہ پر لانا ہو تو ان میں صرف قوتِ عمل کا بیدار کرنا ضروری ہوگا۔ اس کے بعد وہ محسوس کریں گے انہیں مرض کے بدلے شفا مل رہی ہے ضعف کے بدلے قوت اور اضطراب کی جگہ تسکین حاصل ہو رہی ہے لیکن اگر اس (دوسری) جماعت کے مروّجہ دساتیر و آئین سے انہیں ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹنے کی دعوت دیجائے وہ تڑپ اٹھیں گے کہ ان کے معتقدات ان سے چھن رہے ہیں۔ اور معتقدات (غلط ہوں یا صحیح) قلبِ انسانی کے لئے گراں بہا متاع ہوتے ہیں اور وہ اسے یوں لٹتے نہیں دیکھ سکتا۔ اور معتقدات بھی ایسے جو نسلاً بعد نسلٍ آباو اجداد سے ترکہ میں متوارث چلے آرہے ہوں۔ ان کے ہاں نہ صرف معتقدات ضائع ہونے ہی کا صدمہ ہوتا ہے بلکہ آباؤ اجداد کی تعظیم و تقدس لُٹ جانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ جب یہود نے یہ کہا تھا کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں پر ہی چلیں گے تو آباؤ اجداد سے مراد نسبی آباء نہیں تھے بلکہ ان کے متقدمین، احبار و رہبان تھے۔ اس لئے کہ جب قرآن کریم اس لئے کہ جب قرآن کریم میں یہ آیت نازل ہوئی کہ انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدا بنا رکھا ہے۔ تو نبی اکرم صلعم سے عرض کیا گیا وہ انہیں خدا بنا کر پوجتے تو نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ وہ اس چیز کو حلال سمجھتے ہیں جسے ان کے علماء حلال کہہ دیتے ہیں اور اس کو حرام جسے وہ حرام قرار دے دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس طریق پر یہ لوگ چل رہے تھے وہ یہی شریعت اور یہی قوانین تھے اور یہ صرف یہود و نصاریٰ تک ہی محدود نہیں۔ قرآن کریم نے امم سالقہ میں سے ہر امت کے متعلق فرمایا:۔

دوسری قسم کے لوگ

تقلیدِ اسلاف

"اور آپ سے قبل کوئی رسول کسی بستی میں نہیں آیا جس سے وہاں کے راحت پسند لوگوں نے یہ نہ کہہ دیا ہو کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک طریق پر پایا اور ہم انہیں کے نشانات کی اقتداء کرتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ اس پر رسول نے کہا کہ خواہ میں اس سے جس پر تم نے اپنے آباء کو پایا ہے بہتر مقصود پر لیجانیوالا راستہ کیوں نہ لایا ہوں (تم اسی پر چلے جاؤ گے) انہوں نے کہا کہ ہم تو اس سے انکار کرتے ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔ (۴۳: ۲۳-۲۴)"

آج مسلمانوں کی محولۂ صدر جماعت کی حالت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان کی بعینہٖ یہی حالت ہو رہی ہے

یا نہیں؟ وہ جن باتوں کو عینِ دین سمجھ رہے ہیں، ان میں سے ہر بات کی سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رک جاتی ہے۔ ضابطۂ خداوندی، شریعتِ الٰہی کا کہیں نام نہیں آتا۔ کیا یہی "ما وجدنا علیہ اٰباءنا" نہیں؟ کیا ایک عقیدہ، ایک فیصلہ، ایک قانون محض اس لئے منجر الی صراطِ مستقیم اور منزہ عن الخطاء قرار پا سکتا ہے کہ اسے اسلاف میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا جائے؟ مسلمان قرآن کریم کو خدائے حیی وقیوم کا ابدی قانون مانتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ صراطِ مستقیم وہی ہے جو اس سراجِ منیر کی روشنی میں چمکتا نظر آتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ، کیا انہوں نے کبھی اس کی ضرورت سمجھی ہے کہ جو باتیں اسلاف کی کتابوں میں لکھی گئی ہیں انہیں اس صراطِ مستقیم سے مطابقت دے لی جائے؟ قرآن کریم میں تو یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانہ کی ضروریات کیلئے روشنی دیتا جائے۔ لیکن جو باتیں انسان کی پیدا کردہ ہیں وہ تو بہرکیف ماحول سے متاثر اور اپنے اپنے زمانہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انسانی خیالات کا تو یہ عالم ہے کہ ایک مصنف اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف خیالات قائم کرتا اور ان میں تنسیخ و ترمیم کرتا رہتا ہے۔ جب ایک مصنف کی مختصر سی زندگی میں اس کے خیالات قابلِ تغیر ہو سکتے ہیں، تو حیرت ہے کہ اس کے بعد زمانہ خواہ کہاں سے کہاں چلا جائے۔ اس کے خیالات وحئ الٰہی کی طرح ناقابلِ تغیر کیسے ہو جائیں گے؟ قرآن کریم صحیفۂ فطرت ہے۔ فطرت کی کسی چیز کو اٹھا کر دیکھئے، وہ کسی خاص زمانہ سے مقید نہ ہوگی۔ یہ کبھی نہ ہوگا کہ اس شئے کے متعلق جو کچھ تجارب و مشاہدات کسی ایک زمانہ میں عمل میں آ چکے ہوں۔ اس کے فوائد و خصائص جو کسی ایک وقت معین کئے جا چکے ہوں، ان پر مہر لگ جائے اور آنے والی نسلیں گزشتہ محققین کی تحقیق و تفتیش کو نقش آخر سمجھ لیں۔ فطرت کی ہر چیز، ہر زمانہ کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے رہی ہے۔ آج تک کسی شئے نے یہ نہیں کہا کہ بس میں اب تھک چکی۔ اب میں زمانہ کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لیکن تعجب ہے کہ کتابِ الٰہی کو صحیفۂ فطرت ماننے والے اس کے متعلق یہ یقین کئے بیٹھے ہیں کہ اس میں سے جو کچھ لیا جانا تھا ازمنۂ گذشتہ میں لیا جا چکا ہے اور اس کے بعد یہ کتابِ مقدس (نعوذ باللہ) ایک بیکار شئے بن چکی ہے۔ قرآن کریم کا تو یہ دعوے تھا کہ:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۝ ۳۸ / ۸۸-۸۷

یہ قرآن تمام اہلِ عالم کے لئے یاد داشت ہے اور کچھ وقت کے بعد تم اس کے متعلق (خودبخود) جان لوگے

لیکن اس کے حاملین کا اب یہ ایمان ہے کہ عالمین سے مراد محض ازمنۂ گذشتہ و اقوامِ سابقہ ہیں۔ اب چونکہ بابِ تحقیق بند ہو چکا ہے اس لئے اگر عہدِ حاضر کی قومیں اپنے احوال و ظروف کے مطابق اس سے درسِ عبرت و موعظت لینا چاہیں اور اپنی ارتقائی منازل میں اسے شمعِ ہدایت بنانا چاہیں تو جب تک وہ اپنے

آپ کو ہزار پانچسو سال پیچھے نہ لے جائیں اس سے مستفیض نہیں ہو سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو یہ فرمایا کہ کچھ وقت کے بعد تم اس حقیقت کو جان لوگے کہ قرآن واقعی تمام اقوام عالم کے لئے درس موعظت ہے، تو جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا حقیقت بے نقاب ہوتی جائے گی۔ انسان جس قدر ترقی کرتا جائے گا۔ اسکی عملیت اور مدنیت جتنی وسیع ہوتی چلی جائے گی۔ قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آتا جائے گا کہ اسے کسی خاص زمانہ میں مقید کر دینا اس کی امکانی وسعتوں کو پابہ زنجیر کر دینا ہے۔ قرآن کا ساری دنیا کو چیلنج ہے کہ آؤ اپنی عقلوں کی حدِ پرواز کو آزماؤ اور دیکھو کہ قرآنِ کریم تم سے کتنا آگے آگے چلتا ہے۔ لیکن ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ قرآنی کمالات کی جس قدر تکمیل ہونی تھی ہو چکی۔ اب اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

نفس کی حیلہ جوئی

ماضی پرستی کا یہ جذبہ بظاہر بڑا مقدس اور یہ عقیدت بڑی مومنانہ نظر آتی ہے کہ یہ اسلاف کی عزت و تکریم اور اپنے عجز و انکسار کی آئینہ دار ہے۔ لیکن اگر ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو اس کے اندر نفسِ انسانی کی ایک بڑی حیلہ جوئی بھی نظر آئے گی۔ ظاہر ہے کہ تدبر و تفکر، تفحص و تجسس کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے لئے بڑی ذہنی کاوش، دماغ سوزی اور جگر کاوی کی ضرورت ہے۔ اسلاف میں جن حضرات نے تحقیق و تدقیق کے میدان میں قدم رکھا ان کے سوانح حیات پر نگاہ ڈالئے۔ یکسر مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی نظر آئے گی۔ برعکس اس کے، بلا سوچے سمجھے ایک پٹڑی پہ چلے جانا، بڑی تن آسانی کا کام ہے۔ قرآنِ کریم نے جن لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید پر مُصر تھے۔ انکے متعلق ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ مترفین تھے۔ یعنی وہ لوگ آسائش و آرام، سہل انگاری اور تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جس چیز کو ہمارا نفس عام طور پر عقیدت و عظمت کے خوش آئند لباس میں پیش کرتا ہے۔ وہ اکثر اوقات اپنی دوں ہمتی اور سہل انگاری کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔ ورنہ ایک مسلم کی زندگی ذہنی قلبی اور بدنی ہر حیثیت سے، سرتا پا سعی و عمل کی زندگی ہے۔ تگ و دو کی زندگی ہے، اضطراب و سیمابیت کی زندگی ہے۔ یکسر جہاد کی زندگی ہے۔ عقل و بصیرت اور غور و تفکر کی زندگی ہے۔ جمود و تعطل کی زندگی نہیں۔ اور ان دونوں زندگیوں کو قرآنِ کریم نے برابر قرار نہیں دیا۔

اَفَمَنْ يَعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۱۹

کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے نازل ہوا ہے حق ہے۔ اس شخص کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت تو سمجھ دار لوگ ہی قبول کر سکتے ہیں۔

تدبّر و تفکّر

دیکھئے! یہاں یہ نہیں کہا کہ "اَفَمَنْ یُّؤْمِنُ" یعنی وہ شخص جو اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ جو کچھ نبی اکرمؐ کی طرف سے نازل ہوا ہے حق ہے بلکہ اَفَمَنْ یَّعْلَمُ کہا گیا ہے۔ یعنی وہ شخص جو علیٰ وجہ البصیرت اس بات کا علم رکھتا ہے۔ اسی لئے آخر میں کہا گیا کہ نصیحت صرف سمجھ دار لوگ قبول کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایک قدم پر تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے اس کا فیصلہ یہ ہے کہ :-

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۸/۲۲)

اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو گونگے اور بہرے بنے بیٹھے رہتے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے۔

یوں بھی جو لوگ محض عادتاً یا اس روش کی بناء پر جو اسلاف سے متوارث چلی آرہی ہے "نیک کام" کرتے ہیں۔ انہیں نیک اس لئے سمجھتے ہیں کہ ان کاموں کو انکے آباؤ اجداد نیک سمجھتے اور قرار دیتے چلے آئے ہیں، ان سے انکی ذات کی نشوونما ارتقاء اور ذہنی و قلبی جلا قطعاً نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہ خیال کہ بابِ نبوت کی طرح بابِ تدبر بھی بند ہو چکا ہے۔ کبھی قرآن کریم کا منشاء نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے تدبر و تفکر کا حکم کسی خاص قوم یا کسی خاص زمانہ کے ساتھ مقید نہیں رکھا۔ اس لئے اگر یہ سمجھا جائے کہ جس قدر تدبر و تفکر قرآن میں ممکن تھا ہو چکا۔ تو وہ تمام احکام جو قرآن نے تدبر و تفکر کے متعلق دیئے ہیں بیکار ہو جائینگے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم سے تدبر و تفکر کی قوت ساقط ہو جائے اس کا کیا حشر ہوا کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے یہ احکام آج بھی اسی طرح قائم العمل ہیں جس طرح اس سے پہلے تھے۔ صرف ہمارے دماغوں پر برف کے تودے جم رہے ہیں اور نہیں غور کرتے کہ قرآن کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ اس نے کہا ہے کہ:-

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں میں قفل لگے ہوئے ہیں؟ تو جو لوگ پیٹھ پھیر کر ہٹ گئے بعد اس کے کہ سیدھا راستہ ان کو معلوم ہو گیا شیطان نے انکو چکمہ دیا اور انہیں مہلت دی گئی ہے (۴۷: ۲۴-۲۵)

دوسری جگہ ہے :-

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (۴۵ : ۲۱)

یہ لوگ جو برائیوں میں الجھے ہوئے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو ان جیسا رکھیں گے

جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے گا یہ بہت بُرا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔

اس آیت پر ذرا گہری نظر ڈالئے قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ کافر و مومن کی زندگی برابر نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہاں

مسلمانوں کی حالت

یہ حالت ہے کہ مومنین کی زندگی کفار سے بدرجہا پست و ذلیل ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کی کسی مجلس میں جائیے۔ کسی انجمن کی روئیداد پڑھئے۔ کسی کانفرنس میں شریک ہو جائیے۔ ہر جگہ ہر وقت یہی مرثیہ خوانی ہو گی کہ مسلمان ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ ان کی رسوائیوں کی حد ہو چکی ہے۔ حالانکہ ذلت و مسکنت وہ چیز ہے جسے اللہ تعالےٰ نے اپنا انتہائی غضب قرار دیا ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ یہود پر جب ان کے خدا نے اپنا غضب نازل کیا ہے تو انہی الفاظ میں کہ :-

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۲/۶۱)

پس ان پر ذلت اور نکبت کی مار ماری گئی اور وہ غضبِ الٰہی کے مستحق ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس تباہی و بربادی کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے تحقیقاتی کمیٹیاں بٹھائی جاتی ہیں۔ مفکرین قوم سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ اربابِ حل و عقد طرح طرح کی تجاویز پیش کرتے ہیں۔ کئی ہنگامی تحریکیں ابھرتی ہیں اور بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن باایں ہمہ :- تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی :- ان کی پستی و ذلت کے اسباب تلاش کرنے کے لئے ہمیں اس سرچشمہ کا سراغ لگانا چاہیئے جو ان کے عہدِ خوش بختی میں کارفرما تھی۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ قوت یہ رُوح، قرآنی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کی بدولت تھی۔ اس لئے کہ قرآن کریم دنیا میں زندگی کی قوتیں سلب کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ زندگی اور قوت کا پیغام بن کر آیا ہے :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴)

"اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہا کرو کہ جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو زندگی بخشنے والی ہے"

یہ پیغامِ حیات اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو دنیا میں اقوام ہے۔ وہ ہر اس قوم کو جو اس راہ پر گامزن ہوتی ہے۔ شاد کامی و کامرانی کی بشارت دیتا ہے :

یقیناً یہ قرآن اس روش کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے سیدھی راہ ہے (اَقْوَمُ) اور مومنوں کو بشارت دیتا ہے کہ اگر انہوں نے عملِ صالح کئے تو ان کے لئے اجرِ کبیر ہو گا۔ (۱۷ : ۹)

ظاہر ہے کہ جب یہ قوم تمام دنیا کی تہذیبوں کی مالک بنی تھی تو اسی راہِ فلاح پر جادہ پیما ہونے سے بنی تھی۔ اور اگر آج یہ نکبت و افلاس کے ذلیل ترین گڑھوں میں پڑی ہوئی ہے تو اس کی ایک اور صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ اس نے قرآن کریم کے دامن کو چھوڑ رکھا ہے۔ حالت آج یہ ہے کہ قدم چلتے ہیں اور مسافت طے نہیں ہوتی۔ ہاتھ اٹھتے ہیں لیکن ہلاکتوں کا بڑھتا ہوا سیلاب نہیں رُکتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷/۹)

یہ اس لئے کہ انہوں نے قرآنِ کریم سے مُنہ موڑ لیا سو اللہ نے انکے اعمال غارت کر دیئے۔

اس باب میں وہ لوگ جو دانستہ قرآنِ کریم سے اعراض برتتے ہیں اور وہ جو غلط تعلیمات کو حسنِ عقیدت کی بناء پر قرآنی تعلیمات سمجھتے ہیں اور باوجود متنبہ کئے جانے کے پھر بھی اپنے آپ کو راہِ راست پر سمجھتے ہیں۔ دونوں برابر ہیں اس لئے کہ اگر سنکھیا کو زہر قاتل سمجھ کر کھاؤ تو، اور تریاق سمجھ کر نگل جاؤ تو۔ ہلاکت دونوں صورتوں میں لازمی ہے یہی وہ ہلاکت ہے جس کی طرف قومیں بتدریج غیر محسوس طور پر کھنچی چلی جاتی ہیں

" اور جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔ انہیں ہم بتدریج (تباہی کی طرف) لئے جا رہے ہیں۔ اس طرح کہ انکو اس کی خبر ہی نہیں ہوتی۔" (۷ : ۱۸۲)

قرآن کا کس قدر واضح حکم ہے، جس کی مسلمان اس دیدہ دلیری سے مخالفت کرتے ہیں۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵)

تو کیا اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنیوالے کو تلاش کروں حالانکہ وہ ایسا ہے کہ اس نے ایک مفصل کتاب تمہارے پاس بھیجدی ہے

یہی وہ وقت تھا جس کیلئے قرآن نے کہہ دیا تھا:

"کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور جو آپ سے قبل نازل کی گئی ہیں (اور) اپنے مقدمات شیطان کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انکو یہ حکم ہوا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں اور شیطان ان کو بہکا کر گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ (۴ : ۶۰)

یہی وہ واقعات ہیں جن کی رُو سے قرآن کریم کے فیصلے کے مطابق ایک مؤمن، مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک ہو سکتا ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲/۱۰۶)

"اور اکثر لوگ خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔"

اس سے بڑھ کر اور کیا شرک ہوگا کہ آپ اپنے متنازعہ فیہ امور میں احکامِ خداوندی کے مقابلہ میں روایاتِ

کہُن کو ترجیح دیں؟ رواج اور روایات انسانوں کے نقوشِ قدم پر بلاتحقیق و بلاتصدیق چلے جانے کا نام ہے اور اللہ تعالےٰ کا حکم ہے کہ اتباع صرف قرآن کا جائز ہے اور بس:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۷/۳)

اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اس کو چھوڑ کر دوسرے رفقاء کا اتباع مت کرو۔ تم لوگ بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو ـــــــــ

ایک مسلمان کیلئے یہ اتباع و اطاعت بہ جبر و اکراہ نہیں، بلکہ بطیبِ خاطر ہونی چاہیئے یہ نہیں کہ قوانینِ الٰہی کے فیصلوں کو (کافر نتوانی شُد، ناچار مسلماں شو) کی حیثیت سے مانو۔ بلکہ اس فیصلے کے بعد اگر تمہارے دل میں ذراسی تنگی بھی محسوس ہوئی تو ایمان جاتا رہا۔

"پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان دار نہیں ہونگے جب تک یہ بات نہ ہو کہ باہمی اختلافات میں یہ لوگ آپ سے فیصلہ کرایا کریں اور پھر آپ کے اس فیصلہ کے خلاف دِل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پورے طور پر تسلیم کرلیں (۴:۶۵)

یہ ظاہر ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہوگی وہ بہر حال کھُلی ہوئی گمراہی ہوگی۔ خواہ آپ اسے آباؤ اجداد میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کردیں۔ اسی قسم کے فیصلوں کو قرآنِ کریم نے "زمانۂ جاہلیت کے فیصلے" قرار دیا ہے ۵/۵

قرآن اختلاف مٹانے کیلئے آیا ہے

قرآنِ کریم نے اپنے نازل ہونے کی غرض یہ بتائی ہے کہ اقوامِ عالم میں جس قدر اختلافات موجود ہیں ان کو مٹادیا جائے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کو واضح کردیں اور یہ ہدایت و رحمت ہے مومنین کیلئے

تاکہ نوعِ انسانی باہمی نزاعات و اختلافات کی وجہ سے جس سبعیّت و بربریّت میں الجھ رہی ہے باہمی تشتت و افتراق کے باعث جس وحشت و درندگی کا ثبوت دے رہی ہے اس سے نجات حاصل کر کے صراطِ مستقیم اور راہِ سعادت پر گامزن ہوجائے جو وحدتِ انسانی کا راستہ ہے اور جس میں کوئی کجی نہیں کسی قسم کی

…بھی نہیں۔

سب تعریف اس ذات کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور
اس میں کوئی کجی نہیں رکھی (۱۸:۱)

…سین واحسرتا، کہ جو قوم اپنے آپ کو حامل قرآن کہہ رہی ہے۔ تمام دنیا کو ایک مرکز پر لانا تو ایک طرف، خود ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ ہزاروں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ یہ حالت صرف عوام کی نہیں، بلکہ جنہیں عوام کے راہنما ہونے کا دعویٰ ہے وہ خود اسی تشیع و تحزب کی آگ بھڑکانے میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اس چیز کو خدمت دین بتاتے ہیں۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسروں کو ناری بتاتا ہے حالانکہ ہر ایک گروہ اپنے سامنے، قرآن لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ یہود ونصاریٰ پر قرآن کریم نے الزام یہ عاید کیا تھا کہ:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ (۲:۱۱۳)

یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا طریقہ مہمل ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کا طریقہ مہمل ہے۔ اور (طرفہ تماشا) کہ دونوں کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہیں۔

کیا بعینہٖ یہی حالت آج مسلمانوں کی نہیں ہو گئی؟ ذرا غور سے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس علت کے اندر قدرِ مشترک کیا ہے؟ یہود ونصاریٰ کے متعلق، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ قرآن کا اعتراض تھا کہ انہوں نے اپنے رہبان واحبار کو خدا بنا رکھا تھا۔ یعنی حلت و حرمت، جائز و ناجائز میں بجائے کتابِ الٰہی کے، انسانوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اب دیکھئے مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ جب تک مسلمانوں کا کتابِ خداوندی سے تمسک رہا۔ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اختلافی امور میں کتاب اللہ کی جگہ انسانوں کو مرکز بنالیا تو وہی حالت ہو گئی جو یہود ونصاریٰ کی تھی۔ اور ملت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کسی مسئلہ کو سامنے لائیے، ہمارے زوایائے علمِ دین سے کبھی متحد آواز نہیں اٹھے گی۔ ایک کچھ کہے گا اور دوسرا کچھ اور سند میں ہر ایک کسی نہ کسی بزرگ کا نام پیش کر دے گا۔ یہود ونصاریٰ نے اپنی کتابوں میں تحریفِ لفظی بھی کی تھی اور اس کے ساتھ تحریفِ معنوی کی بھی کمی نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے الفاظ کے تحفظ کی ذمہ داری خود لے لی۔ لہٰذا اس میں تو کسی انسان کا کچھ اختیار نہ رہا کہ کوئی کمی بیشی کر سکے۔ لیکن تحریفِ معنوی کا دروازہ تو ہر ایک کے لئے کھلا تھا۔ چنانچہ دانستہ یا نادانستہ یہ تحریف اس انداز سے ہوئی کہ جو لباس کسی کے جی میں آیا قرآن کو پہنا دیا اور وہی لباس

نفسِ قرآن سمجھ لیا گیا۔ اب اگر قرآن کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ شور اٹھتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے انسانوں سے تعلق چھوڑ کر خدا سے تعلق وابستہ کرنا پڑتا ہے اور انسانوں کی محبت "کحب اللہ او اشد حبا" دلوں کی انتہائی گہرائیوں میں سمائی ہوئی ہے۔ کعبۂ دل سے اس بُت کدے کو نکالنا بڑے کڑے حنیف کا کام ہے۔ دل کے اس مرض کا علاج قرآن کے سوا اور کہیں نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ (۱۰/۵۷)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک موعظت کی کتاب آئی (جس میں) تمہارے سینے (کے روگ) کی شفا ہے اور وہ مومنین کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔

یعنی جس طرح تیرنا اُسے ہی آئے گا جو پہلے پانی میں اترے۔ قرآن کریم کا یہ نسخہ شفا اسے ہی دیگا جو دل کو تمام غیر قرآنی خیالات سے صاف کر کے قرآن کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس کے برعکس ایسے قلوب کا خدا حافظ جن کے متعلق قرآن نے خود کہہ دیا ہے :-

"اور وہ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں ہمارے دل اس کی طرف سے پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگ رہے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب ہے سو آپ اپنا کام کئے جائیں ہم اپنا کام کر رہے ہیں" (۴۱/۵)

ماضی پرستی

ان معروضات سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی سے بے نیاز ہونا چاہتے ہیں۔ حال کے استحکام اور مستقبل کی درخشندگی کے لئے ماضی سے وابستگی ضروری ہے۔ ماضی گزرے ہوئے حال ہی کا تو نام ہے لیکن ماضی سے وابستہ ہونا اور ماضی کی پرستش کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ علمائے سلف نے اسلام کی جو خدمات کی ہیں وہ ہمارے لئے باعثِ افتخار و مایہ ناز ہیں۔ اگر ہم آباؤ اجداد کے دنیاوی ترکہ کے وارث بننے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے بلکہ اسے باعثِ عزت سمجھتے ہیں تو ان کے علمی ترکہ کو ہم باعثِ ننگ و عار کیوں سمجھیں؟ اس ترکہ سے ہمارا وقار قائم ہے۔ لیکن ہر چیز کو اسکی اپنی جگہ پر رکھنا بھی ضروری ہے، جیسے کسی کی تحقیر ناروا ہے، ویسے ہی اس کی شان میں غلو و افراط سے کام لینا بھی مستحسن نہیں۔ حضراتِ متقدمین، علم و بصیرت رکھتے تھے لیکن تھے تو انسان ہی۔ خدا تو نہیں تھے۔ انہیں خدا کا مرتبہ دینا نہ انکے حق میں اچھا ہے نہ اپنے حق میں

جس درجۂ امامت و اجتہاد میں وہ پہنچے تھے۔ اس تک آج بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ اور جو مسائل انہوں نے اپنے ماحول کو مدِنظر رکھ کر قرآن کی روشنی میں مستنبط کئے تھے آج کے ماحول کے مطابق ویسے ہی دساتیر و قوانین آج بھی مرتب کئے جا سکتے ہیں، جن کا سرچشمہ وہی اصولِ دین ہونگے۔ لہٰذا سب سے پہلے علماء حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اس بات کو محسوس کریں کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا اور وہ امّتِ مسلمہ کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ رسولِ اکرمؐ نے تو فرمایا تھا کہ مومن کی زندگی کی شان ہی یہ ہونی چاہیئے کہ اس کا آج، گزشتہ کل سے ترقی یافتہ ہو۔ لیکن یہاں ہمیشہ یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے زیادہ بدبخت ہے لہٰذا ایسی قوم کا خدا حافظ۔

اس کے دل سے پوچھئے اس کے جگر سے پوچھئے
آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دُور ہے

اس میں شبہ نہیں کہ آج الحاد و مادہ پرستی کا سیلاب امڈے چلا آ رہا ہے۔ لیکن ان میں سب سے بڑا سبب خود ہمارے علماء حضرات کا بے وجہ تشدّد اور بے معنی تنگ نظری ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اسلام کے احکام دو اقسام پر مبنی ہیں۔ ایک وہ جن میں کسی قسم کا تغیّر و تبدل نہیں ہو سکتا لیکن دوسری قسم ان احکام کی ہے جو امّت کے عام حالات سے تعلّق رکھتے ہیں چونکہ زمانہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے متعلّق احکام بھی اٹل نہیں ہو سکتے چنانچہ قرآن نے یہی کیا کہ ان کے لئے اصول تو وضع کر دیئے لیکن ان کی روشنی میں جزئیات ترتیب دینے کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا رکھا۔ اس دروازے کو بند کر دینا، دین میں، خلافِ منشائے خداوندی، سختی پیدا کر دینا ہے۔ اربابِ عقل و فکر کا کام ہے کہ وہ قوم کی اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی، سیاسی، معاشی ضروریات پر غور کریں اور انہیں اس دین کا راستہ بتائیں جو ان کیلئے ان ضروریات کا حل پیش کر سکے۔

اکاس بیل

آج مسلمانوں کی ترقّی و بہبود کے لئے طرح طرح کی تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں۔ انجمنیں، کانفرنسیں، جلسے ریزولیشن، کمیٹیاں، تحریریں، تقریریں، غرضیکہ ہر ایک دوا اور ہر ایک دعا بروئے کار لائی جا رہی ہے۔ لیکن نہ دوا میں شفا نہ دعا میں اثر، قوم کی حالت روز بروز افسوسناک ہوتی چلی جا رہی ہے اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ اسلام تو ایک شجرِ مقدّس ہے جس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر یہ شجرِ طیّب ہمیں بھی وہ پھل کیوں نہیں دیتا جو اس کی فطرت کا خاصہ ہے؟ اس کا جواب واضح ہے۔ اس کی علّت بالکل عیاں ہے۔

آپ نے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ بیری کے درخت پر بالخصوص، اور دیگر درختوں پر بالعموم، ایک خاص قسم کی بیل پیدا ہو جاتی ہے، جسے اکاس بیل کہتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ تمام درخت پر چھا جاتی ہے۔ آپ اس درخت کو کتنا ہی سینچئے، اس کی کتنی ہی پرورش کیجئے! وہ کبھی بھی برومند نہیں ہو سکتا۔ اس درخت کو آپ کتنی غذا پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ اکاس بیل اتنی ہی بڑھتی جائے گی اور درخت سوکھ کر زرد پڑتا جائے گا۔ جب تک اس بیل کو اتار کر پھینک نہیں دیا جاتا۔ درخت سرسبز نہیں ہوگا۔ قرآن کے شجرِ مقدس پر ایک مدت سے انسانی تعلیمات کی اکاس بیل چڑھی ہوئی ہے۔ لہٰذا آپ اپنی دانست میں شجرِ اسلام کی تقویت کی جس قدر کوشش کر رہے ہیں وہ دراصل اس بیل، اس غیر جنس، کی تقویت کا موجب ہوتی جاتی ہے اسلام کی برومندی و بار آوری کے لئے سب سے پہلے اس بیل کو اتار کر پھینک دینا ضروری ہے۔ اس کے بعد اصل درخت کی پرورش خود بخود ہو جائے گی:۔

ان گزارشات کے بعد کیا باادب دریافت کرنے کی اجازت حاصل کی جا سکتی ہے۔

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۷:۱۶)

کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ انکے دل خدا کی نصیحت اور اس چیز کے لئے جو حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو اس سے قبل کتاب ملی تھی۔ پھر ان پر ایک زمانہ گزر گیا۔ پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے ان میں سے فاسق ہیں۔

قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی
وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی

حضرت رسالتمآب صلعم کی تعلیم اور سیرت کا معاملاتی پہلو

ہر انسان کی شخصیت کے دو بڑے پہلو ہوتے ہیں۔ ایک روحانی (جس میں اخلاقی پہلو بھی شامل ہے) اور دوسرا جسمانی (جو ذہنی پہلو پر بھی مشتمل ہے) شخصیت کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب یہ دونوں پہلو ایک ساتھ متوازن طور پر نشوونما پائیں اور ہر ایک پوری طرح عمل کرے۔ اگر ایک پہلو بھی ناقص رہ جائے، تو پھر اس انسان کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ اور معاشرہ کو اس کی ذات سے کما حقہٗ فائدہ نہیں پہنچتا۔ روحانی اور جسمانی پہلو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور آزاد نہیں ہیں، بلکہ دونوں ایک دوسرے پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس شخص کا جسم اور ذہن جامد ہو کر رہ جائیں اور پوری طرح نشوونما نہ پائیں، اس کی روحانی اور نفسیاتی کیفیت ویسی آب دار نہیں ہو سکتی جیسی ایک تندرست اور صحیح العقل شخص کی ہوتی ہے۔ اسی طرح جس شخص کی روحانی ترقی رُک جائے، وہ اپنے جسم اور قوائے ذہنی سے صحیح طور پر کام نہیں لے سکتا۔ اس جہانِ فانی کی حد تک انسانی زندگی میں روح اور جسم کی ایک ساتھ نشوونما لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

دین اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس نے شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کی نشوونما پر زور دیا ہے۔ دوسرے مذاہب میں جسم کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس مذاہب کے پیروؤں کو جب دنیاوی ترقی کا خیال ہوا، تو وہ مجبور ہو گئی کہ مذہب کو شخصی اور خانگی حیثیت دے کر پسِ پشت ڈال دیں اور سیاسی اور دنیاوی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل دینے کی اجازت نہ دیں۔ اس کے برخلاف اسلام نے ایسی کوئی تفریق روا نہیں رکھی اور معاملات کو بھی دین کا جزو اسی طرح قرار دیا جس طرح عبادت کو اسلامی تعلیم میں حقوق العباد کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی حقوق اللہ کی، بلکہ اوّل الذکر کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ حق تعالیٰ غفور الرحیم ہیں اور اپنے حقوق بھی معاف کر دیتے ہیں لیکن بندوں کے حقوق کے معاملہ میں وہ دخل انداز نہیں ہوتے۔ ایک بندے کا حق دوسرے پر ہو، کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔

اسلام میں علم الاخلاق کی بنیاد اسی حقوق العباد کے اصول پر ہے۔ چونکہ اس کا تعلق انسانی معاشرہ سے ہے جو طبعی کائنات کا ایک جزو ہے۔ اس لئے وہی قانونِ مکافات یعنی عمل اور ردِ عمل پایا جاتا ہے جو طبعی کائنات میں جاری و ساری ہے۔ کسی شخص کے ہر اس عمل کی، جو دوسرے بندوں پر اثر انداز ہو جزا یا سزا ناگزیر ہے۔ بلحاظ اس کے کہ وہ عملِ خیر ہے یا شر۔ معاشرہ میں کسی شخص کا کوئی عمل نہ تو بے اثر ہوتا ہے نہ قابلِ تلافی کیونکہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اس کو واپس نہیں لیا جا سکتا۔ علمِ طبیعیات میں ایسے عمل کو (IRREVERSIBLE PROCESS) کہتے ہیں۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے حضرت رسالت مآب صلعم کی تعلیم اور سیرتِ مبارکہ کے معاملاتی پہلو پر کافی توجہ نہیں کی اور عبادت و توبہ کا غلط مفہوم لیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ اگر انسان کلمہ پڑھے، دن میں پانچ وقت نماز ادا کر دے، رمضان کے مہینے میں روزے رکھ لے، سالانہ زکوٰۃ نکال دے اور عمر بھر میں ایک حج کر لے تو پھر اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس کی نجات یقینی ہے اور جنت اس کے لئے مقسوم ہو چکی ہے۔ اس کے بعد چاہے وہ معاملہ کا کتنا ہی کھوٹا کیوں نہ ہو، لوگوں کے حقوق کی بجاآوری میں کوتاہی کیوں نہ ہو، تجارت اور کاروبار میں بددیانتی کا مرتکب کیوں نہ ہو، اس کی عبادتیں آڑے آئیں گی اور اس کو دوزخ کی آگ سے بچا لیں گی۔ کسی نے اگر حقوق العباد کی کچھ اہمیت سمجھی بھی، تو یہ کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا کہ "توبہ" کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ مرتے دم توبہ کر لیں گے اور سارے گناہوں سے ایسے پاک ہو جائینگے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا نوزائیدہ بچہ۔" گویا بزعمِ خویش وہ قانونِ قدرت کو توڑ سکتے ہیں اور (IRREVERSIBLE) افعال کو (REVERSIBLE) بنا سکتے ہیں۔ عبادت اور توبہ کے اس غلط تصور نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے کہ نہ صرف جدید تعلیم یافتہ مسلمان بلکہ غیر اقوام کے لوگ بھی جب کبھی کسی مذہبی اور مقدس شکل کے مسلمان کو دیکھتے ہیں، تو فوراً اس کی اخلاقی پستی اور بدمعاملگی پر یقین کر لیتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ صرف مذہب سے بیگانہ طبقہ ہی دیندار اشخاص کے متعلق ایسا خیال رکھتا ہے، بلکہ علامہ حالی جیسے اہلِ دل کا بھی یہی تاثر تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

غضب خدا کا۔ جس ذاتِ اقدس صفات نے بنی آدم کو جہالت اور گمراہی کے تحت الثریٰ سے نکال کر علم و عرفان اور کمال شخصیت کے عرشِ معلیٰ پر پہنچنے کا راستہ بتایا ہو، اس کے پیروؤں کے متعلق دنیا کا خیال یہ ہو کہ ان میں جو شخص جتنا زیادہ مذہب پرست ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ پست سیرت انسان ہوگا۔ اس جانکاہ سانحہ پر قلب اور زبان بے اختیار چیخ اٹھتے ہیں۔

یا محمد در قیامت گر براری سر ز خاک
سر برار و ایں قیامت در میان خلق بیں

پھر یہ حالت کسی خاص خطۂ زمین تک محدود نہیں ہے جس کسی نے بھی اسلامی ممالک کا سفر کیا ہے، وہ اگر دیانتداری کے ساتھ

اعتراف کرے اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرے، تو شہادت دے سکتا ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلمان بستے ہیں سیاسی اور مادی انحطاط کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی پستی بھی ضرب المثل بن چکی ہے۔ ممکن ہے بعض گوشوں سے یہ آواز آئے کہ اور دوسری قوموں کی اخلاقی حالت بھی تو کچھ نصب العینی نہیں ہے پھر مسلمانوں ہی کو کیوں موردِ عتاب کیا جا رہا ہے۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ ہم کو سب سے پہلے اپنی حالت کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ دوسرے لوگ اپنی فکر آپ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سوال شدت کا ہے۔ دوسروں کی حالت اتنی خراب نہیں ہے جتنی ہماری حالت ابتر ہے پھر ان قوموں کے متعلق "کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ" نہیں کہا گیا ہے، ان کے پیغمبر خاتم النبیین نہیں تھے، ان کے مذاہب کے متعلق خداوند کریم نے "الیوم اکملت لکم دینکم" نہیں فرمایا ہے، ان کی عبادتوں کی بابت یہ دعویٰ نہیں کیا گیا ہے کہ "وہ فحشاء اور منکر سے باز رکھتی ہیں"۔

مسلمانوں کے متعلق یہ امر قابلِ غور ہے کہ وہ اسلام کے معتقد ہونے کے باوجود قعرِ مذلت میں کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ کیا نعوذ باللہ قرآن کا یہ وعدہ غلط ہے کہ "اگر تم مومن ہو، تو سب سے زیادہ بلند و برتر رہو گے"۔ اذا فات الشرط فات المشروط اگر صغریٰ ہی غلط ہو، تو کبریٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی پستی اگر ایک امر واقعہ ہے، تو قرآنِ کریم کی مذکورہ بالا آیت کی رُو سے اس کا لازمی سبب یہ ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں مومن نہیں ہیں۔ اسلام کے ارکانِ خمسہ پر ایمان رکھنے اور ان فرائض کے بجالانے کے بعد بھی وہ سچے مسلم نہیں کہلائے جا سکتے۔ اس لئے کہ ان کی سیرت میں معاملات کا پہلو ناقابلِ بیان حد تک تاریک ہے۔

روایت ہے کہ رسولؐ اللہ کی خدمت میں ایک بدوی حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں ابھی حال ہی میں مسلمان ہوا ہوں لیکن مجھ سے یہ نماز روزہ وغیرہ اتنے بہت سے جھگڑے نہیں ہو سکتے۔ مجھے صرف ایک بات بتائیے جس پر میں عمل کر سکوں۔ آپؐ نے فرمایا، اچھا تم جھوٹ نہ بولو۔ کہتے ہیں کہ اس نے جھوٹ نہ بولنے کا اقرار کیا اور رفتہ رفتہ اسی ایک بات کی بدولت وہ صالح اور پاکباز مسلمان بن گیا کیونکہ جب کبھی وہ کسی بُرے کام کا قصد کرتا، تو معاً اسے خیال آجاتا کہ لوگ پوچھیں گے، تو سچ کہنا پڑے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی فطرت شناس نظروں میں حُسنِ سیرت اور عملِ صالح کی کس قدر اہمیت تھی۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے، اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ارکانِ خمسہ گویا رکنیت کے چندے کے مماثل ہیں جن کو ادا کرنے کے بعد کوئی شخص مسلم سوسائٹی کا رکن بن جاتا ہے۔ لیکن جس طرح چندہ ادا کرنے کی بنا پر کوئی فرد کسی سوسائٹی کا مفید یا کارکن ممبر نہیں کہلایا جا سکتا بلکہ اس کے لئے سوسائٹی کے اصلی اغراض و مقاصد اور پروگرام پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح محض کلمہ پڑھنے یا نماز روزہ کی ادائیگی سے انسان اسلامی معاشرے میں داخل تو ہو جاتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں مردِ مومن نہیں بن سکتا جب تک اس کی سیرت اور کردار اس قسم کا نہ ہو جو اسلامی معاشرے کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے اور یہ اسلامی سیرت و کردار ہی ہے جس کے متعلق قرآنِ حکیم میں کہا گیا ہے لقد کان فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اگر

ہماری جماعت کے افراد حقیقی معنوں میں مسلمان ہونا چاہیں اور صحیح قسم کے اسلامی معاشرے کی تکمیل کا خیال ہو، تو اس کے لئے اسوۂ حسنہ کا اتباع لازمی ہے۔

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

تاریخ شاہد ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے اپنی رسالت کے ثبوت میں کوئی معجزات پیش نہیں کئے۔ یہ امر بھی مسلّمہ ہے کہ کوئی شخص باہر والوں کی نظر میں ہیرو ہو، تو ہو۔ لیکن اس کے اپنے گھر والے جو اس کو نہایت قریب سے اور ہر لمحہ اُٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے، سوتے جاگتے دیکھتے ہیں، مشکل ہی سے اس کو ہیرو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ آں حضرتؐ کی رسالت پر سب سے پہلے ان کے اپنے گھر والے ایمان لائے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں کو آپؐ کی صداقت، خلوص اور دیانت داری پر اتنا اطمینان تھا کہ جب آپؐ نے رسالت کا دعویٰ کیا، تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ یہ دعویٰ صحت و صداقت پر مبنی نہیں ہے۔

بعثت سے قبل بھی آپؐ کا کردار ہر قسم کی آلائش سے پاک تھا۔ کسی کے سہارے زندگی گذارنے کی بجائے آپؐ نے محنت و مشقت کو ترجیح دی اور تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ لین دین اور معاملہ کے آپؐ اتنے کھرے تھے کہ آپ کی دیانت اور راستبازی زبانِ زدِ خاص و عام ہو گئی تھی اور قوم نے آپؐ کو امین کا لقب عطا کیا تھا۔ لوگ خواہش رکھتے تھے کہ آپ ان کی طرف سے تجارت کریں۔ اس پیشہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے آپؐ کو غیر مقامات کی سیاحت اور دنیا کے حالات سے واقفیت کا موقعہ ملا اور آپؐ نے بتا دیا کہ پاکبازی کی زندگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان ساری عمر پہاڑ کی چوٹی پر گوشۂ تنہائی میں دنیا سے دُور رہے بلکہ تکمیلِ ذات کے لئے ضروری ہے کہ انسان کشمکشِ حیات سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو۔ اس زمانہ کے رجحان کے برخلاف آپؐ نے اپنے مقلدین کو رہبانیت سے اجتناب کی تعلیم دی اور مسلمانوں کو سکھایا کہ وہ خدا سے دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی کے لئے دعا کریں۔ پھر اس دنیا میں بھی آپؐ نے تنہائی اور تجرّد کی زندگی نہیں بسر کی بلکہ ساری عمر اہل و عیال کے ساتھ گذاری اور ہر ایک کو ان کا حق ادا کیا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا کہ آپؐ اسی دنیاوی زندگی میں منہمک ہو گئے ہوں، بلکہ غارِ حرا کی خلوتوں میں غور و فکر بھی آپؐ نے کیا ہے اور خدا کی یاد میں شب بیداری اور تہجد بھی آپؐ کا شیوہ رہا ہے۔ انسان دوستی کوٹ کوٹ کر آپؐ کی ذات میں بھری ہوئی تھی اور خوردوں اور یتیموں سے آپؐ کو بے پناہ محبت تھی۔

جب آپؐ کی قوت و اقتدار انتہائی عروج پر تھے، اس وقت بھی آپؐ کو فقر پر فخر تھا۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ امت کا ہر فرد اپنی جان اور اپنا مال آپؐ پر سے نثار کرنے کو عین سعادت سمجھتا تھا لیکن آپؐ نے کبھی بیت المال سے اپنا پورا حصہ نہیں لیا اور وفات کے بعد کوئی اثاثہ گھر والوں کے لئے نہیں چھوڑا۔ امت میں آپؐ نے اپنے

لئے یا اپنے اہل وعیال کے لئے کوئی خاص مقام مقرر نہیں کیا اور عقیدت مندوں کو خدا کا فرمان یاد دلایا کہ

قل انما ..... قبلہ الرسل

لوگوں کو اوہامِ باطل میں مبتلا رکھنے اور مذہب کے نام سے مقتدایانِ مذہب کا تسلط برقرار رکھنے کی بجائے آپؐ نے سرے سے مذہبی پیشواؤں کا وجود ہی ختم کر دیا اور خالق و مخلوق کے مابین کوئی پردہ حائل نہیں رکھا۔

آپؐ نے اُمّیوں کو تعلیم دی کہ دنیاوی معاملات میں عقل کو استعمال کریں اور غور و فکر سے کام لیں۔ پوری قوم کے سیاسی رہنما اور روحانی قبلہ گاہ ہونے کے باوجود آپؐ نے ہر غزوہ اور جنگ میں ایک معمولی سپاہی کی طرح حصّہ لیا اور اپنی جان خطرہ میں ڈالی۔ جمہوریت، مساوات اور اخوت کی ایسی مثال تو دنیا بیسویں صدی کے اس روشن خیال زمانہ میں بھی نہیں پیش کر سکتی۔ جب کہ مملکت کے صدر تو کجا، خود فوج کے سپہ سالار بھی مضبوط قلعوں یا زمین دوز پناہ گاہوں میں بیٹھے سپاہیوں کو محاذِ جنگ پر روانہ کیا کرتے ہیں۔

آپؐ کی پیدائش ایک ایسی قوم میں ہوئی جو شرک اور بُت پرستی میں مبتلا تھی۔ ان کی جہالت کا یہ حال تھا کہ جب آپؐ نے توحید کا علم بلند کیا، تو اپنی غلطی اور گمراہی کو محسوس کر کے اس نورِ ہدایت کو قبول کرنے کی بجائے، ان کے کُفر و انکار میں اور اضافہ ہوا اور انہوں نے شدّت کے ساتھ آپؐ کی مخالفت پر کمر باندھی اور ہر ممکنہ طریق سے آپ کی راہ میں مزاحم ہو گئے، لیکن اس سے آپؐ کے عزمِ مصمم اور یقینِ محکم میں کوئی فرق نہیں آیا اور آپؐ پوری ہمت اور مستقل مزاجی کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے خدا کا پیام انسانوں تک بہ تمام و کمال پہنچا دیا اور اپنے مشن کی تکمیل کر لی۔

تاریخِ عالم میں کوئی اور دوسری مثال ایسی نہیں ملتی کہ ایک فردِ واحد نے اس قدر بے سروسامانی کے ساتھ ابتدا کر کے نہ صرف ایک قوم بلکہ ایک دنیا کی موجودہ اور آئندہ قسمت میں اس قدر زبردست انقلاب پیدا کیا ہو۔ یہاں تو میں نے شمائلِ نبویؐ میں سے صرف ایک دو نکات ہی بیان کئے ہیں۔ ورنہ بے شمار جلدیں ذکرِ مبارک سے بھری ہوئی ہیں۔ جب خود حضرت ذوالجلال اس ذاتِ پاکؐ کی حمد کرتے ہوں، تو ہماری کیا حقیقت ہے کہ اس کی جرأت کریں۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

مقصود اس مختصر تحریر سے یہ ہے کہ مسلمانوں پر واضح کر دیا جائے کہ وہ کس طرح "باعثِ رسوائی پیغمبر" بن گئے ہیں۔ ان میں کہیں بھی اسوۂ حسنہ کی جھلک نظر نہیں آتی۔ عوام گمراہ ہیں اور خواص ریاکاری میں مبتلا۔ ان کی عبادت کا یہ حال ہے کہ مسجد و محراب بھی ان کے سجدے قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔

بہ زمیں چو سجدہ کردم، ز زمین ندا برآمد — کہ مرا خراب کردی بہ سجدۂ ریائی

اس دور میں امتِ مسلمہ کے ہر فرد کا یہ اہم ترین فریضہ ہے کہ وہ رسولِ کریمؐ کے اسوہ حسنہ کا قلب و نظر کی پوری گہرائیوں اور وسعتوں کے ساتھ مطالعہ کرے اور پھر اپنی حالت پر غور کرے کہ آیا وہ اس قابل ہے کہ اس ذاتِ اقدس صفات کے نام لیواؤں میں شمار کیا جا سکے۔

چوں نہ داری از محمدؐ رنگ و بُو
از درود خود میالا نامِ اُو،

رابطۂ باھمی

اموات

بزمِ کوئٹہ کے سرپرستانِ بادۂ فرقانی سال بھر کی مفارقت کے بعد ۸۔ اپریل ۱۹۹۲ء کو انجمن آرائے کنونشن ہوئے، تو ان میں جناب منیر احمد صاحب بھی تھے۔ چہرے پر لمبے سفر کی تھکان عیاں تھی۔ بستر رکھا ہی تھا کہ زمین پر گر گئے۔ فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا تو معلوم ہوا کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ شام تک طبیعت بحال ہوگئی۔ ڈاکٹروں نے کہا خطرہ ٹل گیا ہے لیکن کچھ دن اور ہسپتال میں رُکنا پڑے گا۔ اس قافلۂ قرآنی میں ان کی عمر رسیدہ خوشدامن اور ان کے جواں سال پسر بھی شامل تھے لیکن فطرت کے پروگرام کے تحت سب بے بس ــــ کنونشن ختم ہوتے ہی خبر ملی کہ منیر صاحب اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ یوں محسوس ہوا کہ شاید کنونشن ہی کے اختتام کا انتظار کر رہے تھے۔ مرحوم کو ان کے آبائی گاؤں میں سپردِ خاک کر دیا گیا ہے۔ ادارہ کی طرف سے محترم محمد عمر دراز اور جناب محمد علی بیگ نے جنازہ میں شرکت کی۔ ادارہ بزمِ کوئٹہ اور مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

۲۔ ڈاک کھول رہا تھا کہ ایک کارڈ ملا۔ لکھا تھا ہمارے والدِ محترم جناب ماسٹر غلام حسین صاحب کی رسمِ چہلم ۲۴۔ اپریل ۱۹۹۲ء کو ہے۔ مرحوم کے لئے دُعائے مغفرت فرمائیں۔ ماسٹر غلام حسین، بزمِ طلوعِ اسلام چکوال اور ہجویری مسجد ایسے نام ہیں جو وابستگانِ فکرِ قرآنی کے ذہنوں پر ثبت ہیں۔ فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت کے لئے مرحوم کی دیوانہ وار کوششیں مدتوں یاد رہیں گی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

۳۔ مکان برائے فروخت

خوبصورت مکان برلبِ موٹروے۔ لاہور۔ رقبہ ½ ۱ کنال، انتہائی سستا۔ رابطہ: معرفت ایڈیٹر طلوعِ اسلام۔

محمد اسلم رانا

مومنین اور کفّار

اس کے حقائق کو صرف وہی پا سکتے ہیں جن کا قلب و دماغ غیر قرآنی تصورات سے پاک ہو جن کا ادراک بے رنگ ہو (سورۃ الواقعہ آیت ۷۹)

نبیٔ اکرم کی ہجرت سے قریشِ مکہ ایسے تلملائے کہ انہوں نے تہیّہ کر لیا کہ مسلمانوں کا تب تک تعاقب کیا جائے جب تک ان کی تحریک (اسلام) کا استیصال نہ کر لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ بن ابی جو ہجرت سے پہلے یثرب کا رئیس تھا، کو ایک خط لکھا :-

"تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم لوگ انہیں قتل کر ڈالو یا یثرب سے نکال دو، ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کر دیں گے اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔"

(بحوالہ سنن ابوداؤد)

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے پر عبداللہ بن ابی نے قریش کی بات نہ مانی جس پر قریش جوشِ انتقام میں ایک لشکرِ جرار لے کر بدر کے میدان میں پہنچ گئے۔ ۱۷ رمضان ۲ ہجری (مطابق ۱۳ مارچ ۶۲۴ء) دونوں جماعتیں آمنے سامنے صف آرا ہو گئیں۔ ایک طرف جانثاروں کی یہ جماعت جو کل ۳۱۳ نفوس پر مشتمل تھی۔ بے سروسامانی کا یہ عالم کہ کل دو گھوڑے تھے، بے ساز و براق، حق و صداقت کی مدافعت و حفاظت کے لئے سر بکف سامنے کھڑی تھی۔ دوسری طرف طاغوتی قوتیں اپنی پوری شوکت و شدّت کے ساتھ ایک ہزار کی جمعیت۔ ایک سو سواروں کا رسالہ، تمام روسائے قریش شریکِ فوج۔ رسد کا یہ انتظام کہ دس دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔

یہ معرکہ انسانیّت کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا تھا۔ اس واقعہ عظیمہ کی اہمیّت کے احساس سے نبیٔ اکرمؐ کا یہ عالم تھا کہ فوجیں میدان میں ہیں اور حضور اس ناصر و معین کی بارگاہِ عالیہ میں جھولی پھیلائے کھڑے ہیں جس کے قانون کی رفاقت و تائید کے بغیر زندگی کے کسی گوشہ میں بھی کامیابی و کامرانی نصیب نہیں ہو سکتی۔ جھولی پھیلائی ہوئی ہے اور محویّت کا یہ عالم کہ ردائے مبارک کندھوں سے گر گر پڑتی ہے اور آپؐ کو خبر

تک نہیں ہوتی اس والہانہ جذب و انہماک سے حضور ربّ العزّت عرض کرتے ہیں کہ :

"بارِ الٰہا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج مٹ گئی تو پھر قیامت تک تیری عبودیّت اختیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔"

مانگنے والے نے اس الحاح و زاری سے مانگا اور دینے والے نے اس بزلہ کریمانہ اور ترحّم خسروانہ سے نوازا کہ کہا : "ہم نے تمہاری بات سُن لی ہے تم گھبراؤ نہیں (اگر دشمن کا لشکر ایک ہزار پر مشتمل ہے تو) ہم تمہاری مدد ایک ہزار ملائکہ سے کریں گے جو مسلسل آئیں گے" (سورۃ الانفال آیت ۹)

یہ ملائکہ کیا کریں گے ؟ کیا مسلمانوں سے یہ کہیں گے کہ تم جاؤ، آرام سے گھروں میں بیٹھو۔ ہم ان دشمنوں سے خود ہی نپٹ لیں گے۔ نہیں خدا کی نصرت اس طرح نہیں آیا کرتی، اس کی نصرت دلوں میں طمانیّت و یقین کی بہار آفریں جنتیں بسا دیتی ہے اور دلوں کی حالت بدلنے سے خارجی حالت بدل جایا کرتی ہے۔ میدانِ جنگ میں جس چیز پر فتح و شکست کا مدار ہے وہ سپاہی کی رُوح ہے۔ اگر اسے اپنے مقصد کی صداقت پر یقین ہے اور اس طرح اسے جمعیتِ خاطر نصیب ہے تو وہ دشمن کے جمِ غفیر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اسی کا نام ملائکہ کی تعبیر ہے ادھر صحابہ کبارؓ کی وہ جماعت ہے جس کا ایمان پوری دنیا کے مومنین کیلئے نمونہ ہے لیکن انہیں بھی تاکید کی جاتی ہے کہ یاد رکھو! جو باطل کے مقابلہ میں پیٹھ دکھائے گا سیدھا تباہی و بربادی کے جہنّم میں چلا جائے گا۔

"مسلمانو! جب کافروں کے لشکر سے تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے (یعنی وہ تم پر ہجوم کر کے چڑھ دوڑیں اور تم ان کے مقابل ہو) تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ (سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرو) اور جو کوئی ایسے موقع پر پیٹھ دکھائے گا، بجز اس کے کہ وہ لڑائی کے لئے پینترا بدل رہا ہو یا اپنی جماعت کی طرف پناہ جوئی کے لئے رُخ کرے تو سمجھ لو وہ خدا کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوا (اور جس کا ٹھکانہ دوزخ ہوا) اس کے پہنچنے کی جگہ کیا ہی بُری جگہ ہے۔" (سورۃ الانفال آیت ۱۶)

بدر کی شکست نے کفّار کے دلوں میں مسلمانوں کی ہیبت بٹھا دی اور اس طرح باطل کا وہ کرّ و فر جو اپنی سرکشی اور عناں تابی میں کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا حق کے ساتھ پہلی ہی ٹکر میں بری طرح مجروح ہوا۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے سایۂ رحمت میں قرآن کی اس تعلیم نے جماعتِ مومنین میں گویا بجلیاں بھر دیں۔ وہ یثرب سے جو چمکی تو دس لاکھ مربع میل کے احاطہ کو محیط ہو گئی۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ

کے دورِ خلافت میں ۲۲ لاکھ مربع میل تک پہنچ گئی اور بڑھتے بڑھتے ہسپانیہ سے دہلی تک پہنچ گئی۔

جب اسلامی مملکت کی ٹیکنالوجی اوجِ ثریا کو چھونے لگی تو جاہ وحشمت کا نشہ غالب آنے لگا اور یہیں سے جاہ وحشمت کے وجوب انسانی کوششوں سے وضع ہونے شروع ہوئے۔ جس سے ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری کے تینوں اژدہے ایک بار پھر حرکت میں آگئے اور جنتی معاشرہ تین مختلف نظاموں میں منقسم ہوگیا۔ پیشوائیت جس کا ذریعۂ معاش عوام ہوتے ہیں، نے بادشاہوں کو زمین پر اللہ کا سایہ بتاتے ہوئے سرمایہ داری کو بھی جائز قرار دیا اور مسلمانوں کو روایات کے گنجلک میں الجھا کر علم پر تحقیق کے تمام باب بند کر دیئے۔ جس سے ذہانت کند ہو کر رہ گئی۔ فکر و عمل میں رابطہ منقطع ہوگیا۔ شرک شاملِ توحید کر لیا گیا جس سے توازن بگڑ کر رہ گیا۔

اس کی تو زندگی میں توازن نہیں رہا
جس نے نفی کو رکھ دیا مثبت نکال کر

قرآنِ کریم میں ہے "یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار مومنین پر غالب آجائیں اگر تم مومن ہو تو یقیناً غالب رہو گے" (۳/۱۳۹)۔ لیکن ظاہر یوں ہو رہا ہے کہ پوری دنیا پر کفار ہی غالب ہیں ـــــ اور ہے بھی ایسا ہی ـــــ لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا میں مومنین نایاب ہیں۔

علامہ اقبالؒ جب آنجہانی مسولینی سے ملے تھے تو دورانِ گفتگو علامہ نے مسولینی سے دریافت کیا کہ آپ کی کامیابی اور فتوحات کا راز کیا ہے۔ مسولینی نے جواب دیا کہ سیدھی سادھی بات ہے۔ لیکن علامہ جو قرآن کے طالب علم تھے، نے کہا نہیں، مسولینی آپ غلطی پر ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ اس حقیقت کو علامہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

لیکن جس چیز میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی وہ ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایسی چیز لے لیتی ہے جس میں اس قسم کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لہٰذا ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے اعمال تعمیری نتائج پیدا نہیں کریں گے تو تم کائناتی نقشہ میں فٹ نہیں بیٹھ سکو گے اور خدا کا کائناتی قانون تمہیں نکال باہر پھینکے گا اور تمہاری جگہ نئی مخلوق لے آئے گا اور ایسا کرنا خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔ (سورۃ ابراہیم آیات ۲۰۔۱۹)

اس وقت مسلمانوں کے قریباً چوالیس ممالک ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو ایک چیونٹی کی دست برد سے محفوظ نہیں سمجھتے ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لئے ہے کہ مسلمانوں کا دین کے تقاضوں کے مطابق نہ تو کوئی مرکز

ہے اور نہ ہی ملّت کا وجود ۔ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے امّتِ مسلمہ کی تاسیس کیلئے مکّہ میں توحید کا مرکز تعمیر کیا تھا۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ہدی اللعالمین (۳/۹۶) تمام اقوامِ عالم کیلئے راہنمائی کا نشان بنایا گیا لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں نے اس مرکز کو نہ تو اس حیثیت میں اسٹیبلش کیا اور نہ ہی اسے اس نظریہ سے تسلیم کیا جس کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اسے تعمیر کیا تھا۔ اس لامرکزیّت کا نتیجہ ہے کہ مسلم ممالک (غیروں کی) اقوامِ متحدہ کی طرف رُخ کرتے ہیں جس مقصد کیلئے کعبہ تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ مقرر کیا تھا کہ ہر معاملہ میں اس کی طرف رجوع کیا جائے ۔ بالفاظِ دیگر اس نظام کی طرف رجوع کیا جائے جس کا محسوس و مشہود مرکز (قبلہ) کعبہ ہے ۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"جماعتِ مومنین کو امتہ وسطیٰ (بین الاقوامی امّت، مرکزی حیثیت رکھنے والی جماعت) بنایا ہے تاکہ یہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرتے رہیں اور ان کے اعمال کی نگرانی ان کا مرکز کرے"

(سورۃ البقرہ آیت ۱۴۳)

ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے (قرآن کی رُو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کی بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے ۔

صرف علم سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہو سکتی ہے قلبی ایقان نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے تنہا علم کوئی انقلاب پیدا کر سکتا ہے نہ ہی حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے۔

علی محمد چدھڑ

قرآن خوانی یا قرآن فہمی

قرآنِ کریم ایک ایسی کتاب ہے جو ہمیں دنیا میں زندگی بسر کرنے کے طریقے بتاتی ہے۔ ظاہر ہے، پھر اس کتاب کو پڑھا اس لئے جائے گا کہ سمجھا جائے اور سمجھا اس لئے جائے گا تاکہ زندگی کے وہ تمام طریقے جو اس میں درج ہیں معلوم کرکے ان پر عمل کیا جائے۔ قرآن اپنے آپ کو ہدایت، رہنمائی اور نور بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول درج ہیں، وہ اپنے مضامین پر دلائل کے ساتھ دعوتِ غور و فکر دیتا ہے اور ہر صاحبِ علم کو تدبّر و تفکّر کی تاکید کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عقل کی آنکھ کے لئے سورج کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ تمام بنی نوعِ انسان اس کی روشنی سے مستفید ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تمام مقاصد بلا سوچے سمجھے قرآن پڑھنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ ہرگز نہیں؛ تو پھر مسلمانوں کے دلوں میں یہ کیوں بٹھا دیا گیا ہے کہ قرآن کا مصرف صرف اس کے الفاظ کی تلاوت ہے۔ دراصل یہ ایک سازش تھی جو مسلمانوں کو قرآن سے دُور رکھنے کے لئے کی گئی تھی۔ ہمارے مذہبی عناصر نے بعض وضعی روایات کے حوالے سے بتایا کہ قرآن کے الفاظ بلا معانی اور مطلب پڑھ لینے سے بھی ثواب ملتا ہے۔ صرف الف۔ لام میم پڑھ لینے سے تیس نیکیوں کا ثواب مل جاتا ہے اور جب اس "ثواب" کا ذکر آ گیا، تو پھر اور بھی کئی خود ساختہ عقائد سامنے آ گئے۔ یعنی انسان جب تک زندہ رہے کچھ اس قسم کی نیکیوں اور ثواب کو اکٹھا کرتا رہے اور جب قریب المرگ ہو جائے، تو سورۂ یٰسین کی تلاوت کرکے اس کی جان کنی کی تکلیف کو آسان کر دیا جائے۔ لیکن بات مرنے سے بھی ختم نہیں ہوتی۔ یہاں سے ایصالِ ثواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی مرحوم کے قُل، دسویں اور چالیسویں پر قرآن خوانی کے ذریعہ جو ثواب حاصل ہو، وہ کسی مولوی کے وسیلے سے مرنے والے کی روح کو منتقل کر دیا جائے۔ اسی طرح مرحوم کی ہر برسی پر بھی اسی قسم کا ثواب اسے پہنچتا رہے۔ اس مقصد کے لئے مذہبی درسگاہوں کی خدمات حاصل کر لی جاتی ہیں اور وہاں سے قرآن خوانی کے لئے حسبِ ضرورت طالب علم منگوا لئے جاتے ہیں۔ قرآن خوانی دراصل ایک خود ساختہ غیر قرآنی اصطلاح ہے جس کا قرآن کے سمجھنے سمجھانے سے کوئی تعلق

نہیں۔ یہ مذہبی رسم ہمارے معاشرہ میں اس حد تک سرایت کر گئی ہے کہ اپنے قومی رہنماؤں کی تعلیم پر عمل کریں یا نہ کریں، م
پران کی برسی کے موقع پر قرآن خوانی کا اہتمام ضرور کرتے ہیں۔ کسی عالی شان رہائشی یا قومی عمارت کے افتتاح کے موقع پر
قرآن خوانی لازمی اور باعثِ برکت سمجھی جاتی ہے۔ نزولِ قرآن کا آغاز رمضان کے مہینہ میں ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ قرآن
سالگرہ کا مہینہ ہے۔ اس میں بھی ہم قرآن خوانی کا اہتمام بطورِ خاص کرتے ہیں۔ مساجد میں شبینہ کی محفلیں سجا
جاتی ہیں اور یوں یہ سارا مہینہ بھی قرآن خوانی میں گذر جاتا ہے۔ باقی رہا قرآن کی تعلیم پر عمل کا سوال، تو اس سے م
تعویذ، نقوش اور وظائف ہی لئے جاتے ہیں، جن سے انسانی مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو اعمالِ قرآ
مرتبہ مولانا اشرف علی تھانوی، جو ساری کی ساری ایسے ہی مسائل کے حل سے بھری پڑی ہے)۔ ہماری مذہبی پیشوائیت د
زبان سے یوں تو تسلیم کرتی ہے کہ قرآن سمجھ کر پڑھنا افضل ہے لیکن زور پھر بھی آجا کے قرآن خوانی پر ہی دیا جاتا ہے اور
قرآن فہمی کا لفظ شاذ ہی سننے میں آتا ہے۔ یہ سب کچھ بلا غرض و غایت نہیں۔ اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ سبھی جانتے
ہیں کہ قرآن استحصالی قوتوں کو برداشت نہیں کرتا۔ جب بھی صدرِ اوّل کی طرح ضابطۂ خداوندی نافذ ہو گیا، پیشوائیت
کا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔ جاگیرداری، آمریت اور سرمایہ داری کے نظام کی جڑ کٹ جائے گی۔ آپ خود غور فرمائیں کہ
مذہبی اجارہ دار کب چاہیں گے کہ پبلک اور پرسنل لا کی ثنویت ختم ہو جائے، جو طاقتیں من مانی کرنے کی عادی ہیں،
وہ خدائی ضابطہ کی پابندی کیسے گوارہ کر سکتی ہیں، آمریت کے رسیا جمہوریت اور انسانی حقوق کی راہیں ہمیشہ مسدود رکھتے
ہیں اور اگر کوئی خدا کا بندہ قرآنی فہم و شعور کی روشنی میں ان راہوں کی کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے، تو اسے یہ کہہ کر خاموش
کر دیا جاتا ہے کہ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ قرآنی سمجھ بوجھ ہمارے اسلاف کا کام تھا اور وہ اسے بطریقِ احسن
کر گئے ہیں۔ یہ بڑا کٹھن کام ہے اور کسی عام آدمی کے کرنے کا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ قرآن کوئی ایسی پیچیدہ یا
مشکل کتاب نہیں ہے جسے سمجھا ہی نہ جا سکے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ صاف، واضح، آسان اور غیر مبہم کتاب ہے۔
اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ قرآن کا جمع کرنا اور بحفاظت رکھنا
ہمارے ذمہ ہے، تمہارے ذمہ اس کے احکام و قوانین کا اتباع کرنا ہے۔ اتباع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے
مطالب نہایت وضاحت سے سامنے آجائیں۔ لیکن یہ کام بھی کسی مولوی پر نہیں چھوڑا، اس کی وضاحت بھی خدا
نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم ایک مضمون کو مختلف آیات میں بار بار لاتے ہیں اور اس طرح پوری وضاحت
کر دیتے ہیں۔ سبحان اللہ، کتنی آسانیاں پیدا ہو گئیں اس آخری اور مکمل سرچشمۂ حیات کو سمجھنے کے لئے، لیکن
کیا کیا جائے، ہماری پیشوائیت اس وضاحت کو تسلیم نہیں کرتی اور چاہتی ہے کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف آنے ہی
نہ پائیں (۹/۳۴) اور اگر کوئی رجوع کر بیٹھے، تو پھر اسے خدا کے راستے کی طرف آنے سے روک دیا جائے (۹/۹)۔

اندر جا کر دیکھو تو بُت پتھر کے
پر مندر کا کلس کتنا سنہرا ہے

ہمارے مولانا حضرات کہتے ہیں کہ قرآن کی تشریح اور وضاحت روایات کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ وہ سورج کو بصیرت کی آنکھ سے نہیں بلکہ اغیار سے مستعار سہاروں کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ شاید وہ نہیں جانتے کہ وحی حق ہے اور حق کبھی بھی ظن و تخمین کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا، قرآنی سوجھ بوجھ اتنی مشکل نہیں ہے جتنی پیچیدہ ہمارے ملاؤں نے بنا دی ہے۔ دراصل وہ چاہتے ہیں کہ زیادہ تر لوگ قرآن فہمی کے بجائے، قرآن خوانی سے ہی گذارہ کریں اور جو پڑھے لکھے لوگ احکامِ خداوندی کو سمجھنا چاہیں وہ انہیں انہی کے بنائے ہوئے سانچے کے مطابق اسرائیلی روایات پر مشتمل تفاسیر پڑھا دیں تاکہ

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

قرآن کے الفاظ بلا سوچے سمجھے پڑھنے اور دہرانے سے ثواب ملتا ہے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے، البتہ اس عقیدے کو فروغ دینے سے قرآن فہمی کی حیثیت ضرور ثانوی رہ گئی ہے، ملّا ازم کا مستقبل تو محفوظ ہو گیا، لیکن بنی نوع انسان، وحی پر مشتمل مستقل اقدار و قوانین کے اس خزانے (قرآن) کے درمیان بے خبری کے پردے حائل ہو گئے۔ یقین کریں کہ اقوامِ عالم کو آج تک ہم قائل نہیں کر سکے کہ انسانیت کے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ دیگر اقوام کو قائل کرنا، تو درکنار، ہمارے اپنے نوجوان ان مذہبی تشریحات کو پڑھ پڑھ کر الٹا قرآن سے ہی دور ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ مروّجہ تفاسیر کا مطالعہ کریں، انکشاف یہ ہو گا کہ خدا کی کتاب میں کس دیدہ دلیری سے تشکیک و ابہام کی کوشش کی گئی ہے۔ جگہ جگہ مختلف اور متضاد قسم کی روایات کی ایک آکاس بیل اس خوبصورتی سے چڑھا دی ہے کہ مفہوم کا اصل حُسن ہی دھندلا کر رہ گیا ہے۔ ایک عام آدمی اگر ایسی تفاسیر پڑھ کر یقیناً سوچے گا کہ آخر خدا کے اس کلام سے میں کیا نتیجہ اخذ کروں۔

بات دوسری طرف نکل گئی جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ مذہب کے نام پر لاکھوں روپے وصول کرنے والے ہمارے پیشوا قرآن فہمی کا اس میں حصّہ کیوں نہیں رکھتے۔ بس یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی کون مارتا ہے۔ ہمارا مذہبی طبقہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ وحیٔ خداوندی کو دلیل و بُرہان پر پرکھنے والی قوم کبھی بھی پسماندہ، جاہل اور توہم پرست نہیں رہ سکتی۔ لیکن مسلمانوں کا جاہل، توہم پرست اور پسماندہ رہنا ملّاؤں کی اشد ضرورت ہے۔ لوگوں میں قرآنی فہم و شعور جب بھی عام ہو گیا، مذہب کے جعلی عقائد اور منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ تقدیر و کرامات اور بخشش کی جگہ محنت اور جُستجو کا جذبہ لے لے گا، سُستی اور کاہلی حرکت اور ولولے میں بدل جائے گی، ان ہونی اور پُراسرار داستانوں سے اسلام کی جان چھوٹ جائے گی۔ حقائق نکھر کر سامنے آجائیں گے۔ مرضی کے خدا کی جگہ اصول و قوانین کا خدا لے لے گا اور جب ایسا ہو گیا، تو مولوی کی ساری رعونت ہوا ہو جائے گی، مذہب کے تقدّس کا سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ لہٰذا قرآنی فکر و تدبّر ملّاؤں کے بس کی بات نہیں۔

ان کی اسی میں خیریت ہے کہ احکامِ خداوندی سے مسلمانوں کو دُور رکھا جائے اور خدا کی اس کتاب سے راہ نمائی حاصل کرنے کے بجائے اسے مقدس غلافوں میں لپیٹ کر کسی اونچی جگہ پر رکھ دیا جائے اور بنی اسرائیل کی طرح پھر زعمِ باطل یہ ہو کہ ساری خدائی میں صرف ہم ہی خدا کے پیارے ہیں۔ قرآن کے مقام و مرتبے کو اگر سامنے رکھا جائے، تو بے شک یہ ایک ایسی نایاب کتاب ہے جس پر سب سے زیادہ غور و تدبّر کی ضرورت تھی اور ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس خطۂ زمین پر یہی وہ واحد کتاب ہے جسے سوچ سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ہمارے لئے یہ افسوس کا مقام ہے کہ ایک طرف تو ہم بنی اسرائیل کو ایک مردود و مغضوب قوم سمجھتے ہیں اور دوسری طرف اسی کی پیروی میں اپنی کتاب سے وہی سلوک کرتے ہیں جو اس قوم نے تورات سے کیا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہمیں بنی اسرائیل کی مثال دینے کے بعد متنبہ کرتے ہیں کہ

> "انھیں (بنی اسرائیل کو) تورات دی گئی اور ان سے کہا گیا کہ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس پر عمل کریں۔ لیکن انہوں نے (کتاب کو تو سر آنکھوں پر اٹھالیا) لیکن اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو نہ اٹھایا۔ ان کی مثال ایسی سمجھو، جیسے گدھے پر بڑی بڑی کتابیں لاد دی جائیں اور وہ انہیں اُٹھائے اٹھائے پھرے۔ (ظاہر ہے اس سے اس گدھے کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا)۔ یہی مثال اس قوم کی ہے جو قوانینِ خداوندی کی صداقت کا زبان سے تو اقرار کرے لیکن عملاً اس کی تکذیب کرے۔ اس قوم کی حالت جس قدر زبوں ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔ ایسے لوگوں کو جو خدا کی کتاب کے ساتھ اس قسم کا سلوک کریں، کبھی راہنمائی نہیں مل سکتی۔ (کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک گدھا محض اس لئے صحیح راستے پر چلا جائے کہ جو کتاب اس کی پیٹھ پر لدی ہے اس میں صحیح اور غلط راستے کو تمیز کر کے دکھایا گیا ہے۔" (۵/۶۲)، مفہوم القرآن)

معلوم یہ ہوا کہ خدا کی کتاب سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اسے سمجھ سوچ کر پڑھیں اور اس پر عمل کریں اور پھر ایسی کتاب کا فہم و ادراک تو اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ جس کا دعویٰ یہ ہو کہ اس کے پاس بنی نوع انسان کے لئے ہر معاملہ میں راہنمائی موجود ہے۔ نیز اس میں وہ تمام عملی اصول (فارمولے) درج ہیں جو انسانیت کے لئے قیامت تک فلاح و کامرانیوں کی مکمل ضمانت دیتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے قرآن فہمی کے بجائے قرآن خوانی کی راہ اختیار کی اور قرآن کو سمجھنے کی اہمیت ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مزید برآں ریشمی غلافوں میں لپیٹ اور چُوم کر ہم نے ضابطۂ خداوندی کو مقدس صحیفہ بنا دیا، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی قسم کھائی جا سکے۔ اس کی جانب پیٹھ ہو جانے سے بے ادبی نہ ہو جائے اور اگر اُسے پڑھا جائے، تو محض بغرض 'ثواب'، خواہ وہ ثواب اپنے لئے ہو یا مُردوں کو بخشنے کے لئے۔ یہی نہیں، بلکہ اپنے اس بچگانہ مسلک کی تائید میں حضورؐ سے وضعی روایات بھی منسوب کر دیں تاکہ اس قسم

کے عقائد اور بھی پکے ہو جائیں۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) مستدرک، حاکم میں ہے کہ آیت الکرسی جس گھر میں پڑھی جاتی ہے، اس گھر سے شیطان نکل بھاگتا ہے۔

(۲) ترمذی میں ہے کہ سورۂ بقر کی آخری دو آیتیں کسی جنگل میں تین دن رات پڑھی جائیں، تو پھر وہاں شیطان کا اثر نہیں ہوتا۔

(۳) نسائی میں ہے کہ سورۂ یٰسین قرآن کا دل ہے، جو بندہ اس کو رضائے الٰہی اور دارِ آخرت کے لئے پڑھتا ہے، وہ بخشا جاتا ہے۔ تم اسے اپنے مُردوں پر پڑھا کرو۔

(۴) موطا، امام مالکؒ میں ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کو قل ہو اللہ احد پڑھتے ہوئے سُن کر فرمایا کہ اس پر واجب ہو گئی۔ کسی نے دریافت کیا کہ کیا واجب ہو گئی۔ فرمایا جنّت واجب ہو گئی۔

(۵) حاکم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خوش آواز قرآن خواں کی آواز کو نہایت شوق سے سنتا ہے جیسے کوئی گانا سننے والا گانے والے کی آواز کو سنتا ہے۔

اور آخر میں مذہب کے ایک بہت بڑے نمائندے کی زبانی قرآنی الفاظ پڑھنے کا ایک عجیب و غریب استعمال سنیئے۔

> "چنانچہ ایک بی بی کی مانگ باوجود کوشش بار بار سیدھی نہ نکلتی تھی" احقر نے کہا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ پڑھ کر مانگ نکالو۔ چنانچہ اس کا پڑھنا تھا کہ مانگ بے تکلف سیدھی نکل آئی۔ احقر نے یہ حکایت اس لئے عرض کی ہے کہ کوئی طالب بھی اس معمول کو اختیار کرے، تو امیدِ نفع اور برکت ہے۔" (اعمالِ قرآنی حصّہ سوم صفحہ ۱۳۰
>
> مولانا محمد اشرف علی تھانوی)

قارئین کرام! پنجابی کا ایک محاورہ ہے کہ "کھنوں پھولیاں لیراں ای نکلدیاں نیں" بات جب مذہب کی ہوگی، تو اسی قسم کی الف لیلوی اور کراماتی کہانیاں ہی سننے کو ملیں گی۔ البتہ ان دو چار حوالوں پر اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے، تو یہ معلوم کر کے ہمیں بڑی مایوسی ہو گی کہ اس قسم کے پڑھنے اور پڑھانے میں ہمیں اغیار کی غلامی اور ذلّت کے سوا کچھ بھی تو حاصل نہیں ہُوا اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، تو پھر یہ پستی اور ذلالت چہ معنی دارد۔ جواب ایک ہی ہے، جو قوم اپنی کتاب کے ساتھ اس قسم کا مذاق کرتی ہے، وہ بذاتِ خود اقوامِ عالم کے مذاق کا نشانہ بن جاتی ہے۔ جو لوگ اس پڑھنے اور پڑھانے یا محض قرآن خوانی سے بزعمِ خویش یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم خدا کے مقرّب اور متقی بن جائیں گے، تو وہ قرآن کی اس آواز پر کان دھریں کہ "خود ہی یہ خیال نہ کر بیٹھو کہ تمہارے نفس کا تزکیہ ہو رہا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ متقی کون ہے (۵۳/۳۲)"۔

دوسرے مقام پر خود ہی بتا دیا کہ متقی کون ہے۔ یعنی وہ جو

"اپنا مال بلکہ سب کچھ، اپنی ذات کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔" (۹۲/۱۸)

تصریحاتِ بالا سے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ہم نے اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنا ہے، تو پھر ہمیں قرآن کو نہ صرف سوچ سمجھ کر پڑھنا بلکہ اس پر عمل بھی کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔ اور یہ جو قرآن فہمی کے بجائے قرآن خوانی کی جس راہ پر مُلّا نے قوم کو لگا رکھا ہے، اگر دنیا کی ساری کی ساری پانچ ارب آبادی کے لوگ بھی مسلمان ہو جائیں اور سب کے سب قرآن خوانی میں مصروف ہو جائیں، تو وہ "ضالّین" ہی کہلائیں گے، منعم علیہ میں پھر بھی شامل نہیں ہو سکیں گے۔

حضور نبیٔ اکرمؐ

انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں، جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصّے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآنِ کریم ہے۔

جنسیات کے معاملہ میں بھوک، پیاس کی طرح اضطراری حالت پیدا ہی نہیں ہو سکتی، یہی وجہ ہے کہ بھوک کی اضطراری حالت میں حرام کھا لینے کی اجازت ہے لیکن جنسی اختلاط کے لئے ناجائز فعل کی کسی حالت میں اجازت نہیں۔

یہ مضمون طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۹۲ء میں پڑھا گیا

عبداللہ ثانی

قرآن کا معاشی نظام

محترم صدر اجلاس اور معزز سامعین گرامی!

پوری دنیا اس وقت کسی ایسے نظام کی تلاش میں حیران و پریشان اور سرگرداں ہے جو بنی نوع انسان کے معاشی نظام کی ضمانت دے سکے اور جس نظام کا نقطۂ ماسکہ یہ ہو کہ "کوئی بھوکا نہ سوئے"۔ کہنے کو تو یہ جملہ انتہائی آسان ہے لیکن اگر آپ اس کی گہرائی میں جائیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ بھوک کی حالت میں نیند بھی نہیں آتی۔ نیند اس وقت خوب خوب آتی ہے جب کوئی سیر ہو کر سونے کے لئے پاؤں دراز کرے۔ اب تک جتنے بھی نظام پیش کئے جا چکے ہیں سب کے سب آزمائے جا چکے ہیں۔ آخری نظام جو تقریباً ستر سال تک ایک سراب سے زیادہ کچھ نہ تھا کمیونزم کی شکل میں آزمایا گیا۔ کمیونزم ہو یا اس کی تبدیل شدہ شکل سوشلزم ہو یا پھر اپنے سابقے کے اعتبار سے اسلامی سوشلزم ہو۔ سب کے سب آزمائے جا چکے ہیں۔ کون جانتا تھا کہ کمیونزم کا نظام اپنی زبردست جاذبیت کے باوجود ستر سال کے بعد نانِ شبینہ کے لئے محتاج ہو جائے گا۔ آج آپ خود دیکھ رہے ہیں۔ ٹوٹنے پر جب یہ نظام آیا تو پھر اسے سال نہیں لگے بلکہ چند ہفتوں میں اس نظام کی دھجیاں بکھر گئیں۔ یہ اپنے طور پر ایک علیحدہ بحث ہے کہ کیا اس نظام کو ناکام کروایا گیا؟ یا یہ خود اپنی موت مر گیا۔ ہم اس تفصیل میں فی الحال جانا نہیں چاہتے۔ ہمارے سامنے قرآن کا معاشی نظام ہے اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کا پیش کردہ نظام قابلِ عمل ہے بھی یا نہیں۔ پھر اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ اس کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟ یعنی جسے انگریزی میں HOW TO START AND FROM WHERE? کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم سے سینکڑوں آیات پیش کر کے عوام سے دادِ تحسین تو لی جا سکتی ہے لیکن جب یہ کہا جائے کہ اس کا آغاز کہاں سے کیا جائے تو پھر بڑے سے بڑا عالمِ قرآن بھی بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔ میں نے قرآن کے معاشی نظام پر کئی کتابیں پڑھی ہیں، کئی مباحثوں میں حصہ لیا ہے، کئی سیمناروں میں حاضری دی ہے۔ چھوٹے

چھوٹے سینکڑوں مضامین پڑھے ہیں۔ لیکن آج تک یہ تعین نہ ہو سکا کہ آخر اس کا آغاز کہاں سے اور کیسے کیا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے اہم نکتہ یہی ہے۔ اس کی مثال کچھ یوں دی جا سکتی ہے کہ جیسے شریعت کورٹ نے "ربٰو" کو سود کے کھاتے میں ڈال کر حرام تو قرار دے دیا (جو حقیقت میں ہے بھی حرام) لیکن کوئی متبادل نظام جو آج کے ترقی یافتہ دور کے ساتھ ہمدوش ہو کر چل سکے، پیش نہیں کر سکی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارلیمنٹ میں اب شرعی عدالت کے اختیارات کم کرنے کا بل پیش کیا جا رہا ہے۔ یعنی کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ کل کلاں شرعی عدالت پوری پارلیمنٹ کا بوریا بستر گول نہ کروا دے۔ (حالانکہ اتنی بے بس اور جکڑی ہوئی عدالت شاید ہی کوئی ہو جسے پہلے ہی آئین نے قدم قدم پر باندھ کر رکھ دیا ہے۔ آج بھی شرعی عدالت بعض قوانین کو قرآن کی روشنی میں غیر اسلامی قرار نہیں دے سکتی)۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور خداوند لم یزل کے بنائے ہوئے قوانین میں یہی فرق اور خطِ امتیاز ہے۔ قرآنی قوانین میں کوئی سودا بازی یا مفاد پرستی نہیں۔ انسان خود انسان کو اختیارات دے کر کم کر دینا بھی جانتا ہے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ بھی دیتا ہے جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

قرآن کے معاشی نظام کو سمجھنے اور پھر اس پر عمل پیرا ہونے سے پہلے ہمیں یہ تو سمجھ لینا چاہیئے کہ معاشی نظام ہے کیا چیز؟

معاش کا مصدر عَاشَ، یَعِیْشُ، عَیْشًا، معاشًا، مَعِیْشَۃٌ۔ اس نے زندگی گزاری۔ العیش زندگی۔ زندگی گزارنا۔ چونکہ روٹی کے بغیر زندگی نہیں گزاری جا سکتی اس لئے العیش روٹی کو بھی کہتے ہیں ــــ اسی طرح سامانِ زیست کو بھی کہا جاتا ہے اور اس کی جمع معایشُ ہے۔ عیاش روٹی بیچنے والے کو کہتے ہیں۔ تعیش۔ اسبابِ زندگی کے لئے کوشش کرنا۔ قرآنِ کریم میں ارض کے متعلق ہے:

وَ جَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ (۱۰/۷، ۱۵/۲۰)

اس میں تمہارے لئے سامانِ زندگی پیدا کیا۔

قرآنِ کریم کی اس چھوٹی سی آیت جو صرف چار الفاظ پر مشتمل ہے، میں زمین کی بنیادی حیثیت کا تعین کر دیا گیا ہے۔ یعنی زمین دراصل وسائلِ پیداوار کی منبع ہے۔ زمین ہی سے روٹی، کپڑا اور مکان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ زمین کا مالک انسان نہ ہو۔ غور فرمایئے! روٹی زمین سے حاصل ہوتی ہے، کپڑا ہمیں زمین سے ملتا ہے اور ہمارے سر چھپانے کا سامان بھی زمین پر ہوتا ہے بلکہ اس کے لئے کسی بھی چیز کی ضرورت زمین ہی مہیا کر کے دیتی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ آدم جس جنت میں تھا اس میں سامانِ زیست یعنی روٹی، کپڑا اور مکان بڑی فراوانی سے ملتا تھا اور اس کے لئے اسے جان سوز مشقتیں برداشت نہیں کرنا پڑتی تھیں۔ انسان نے اس زمین پر جنتی زندگی بھی گزاری ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ ذاتی مفادات نام کی شے سے واقف نہ تھا۔ اس کی سوچ اجتماعی مفادات میں

غرق رہتی تھی لیکن جب اجتماعی مفادات نے انفرادی مفادات کی شکل اختیار کر لی تو وہی زمین جو قدم قدم پر جنت بداماں تھی رفتہ رفتہ جہنم آغوش ہوگئی اور انسان خود انسان کا دشمن ہوگیا۔ کہنے کو تو یہ ساری کائنات اللہ ہی کی ہے لیکن دنیا کے کسی ملک میں آپ اللہ کے نام پر ایک انچ زمین نہیں دکھا سکتے۔ دُور جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خود اپنے علاقے کے کسی پٹواری کے ہاں جاکر رجسٹر انتقالات میں خانہ ملکیت میں آپ خدا کے نام پر ایک مرلہ زمین دکھا دیں تو میں ہر قسم کی سزا کے لئے تیار ہوں۔ اس سے بڑی خود فریبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم جو کہتے ہیں اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ ہمارے قول اور فعل کے اس تضاد نے ہماری زندگی جہنمی بنا دی ہے یعنی ہم قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں، اس کا یہ قانون واضح ہے کہ

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۴)

اور جو بھی ہمارے ضابطۂ قوانین سے اعراض برتیگا اس کی معیشت تنگ ہوجائیگی۔

بھلا ہو مولوی صاحب کا جس نے ذکر کا ترجمہ "اللہ اللہ کہنا" کر دیا۔ ہزار ہزار دانوں پر مشتمل تسبیح پھیر کر میں اس انتظار میں رہتا ہوں کہ میری معیشت (یعنی وہ زندگی جس میں سامانِ زندگی فراوانی سے موجود ہو) درست ہوجائیگی۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے آگے فرمایا۔ وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى — اور ہم اسے قیامت میں بھی اندھا اٹھائیں گے۔

قرآنِ کریم کا یہ فیصلہ کہ جو قوم خدا کے قانون کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے اس کی روزی تنگ ہوجاتی ہے۔ اسے سامانِ زندگی کی محتاجی ہوتی ہے۔ وہ مفلس اور مفلوک الحال ہوجاتی ہے اور پھر اس کی عاقبت بھی خراب ہوجاتی ہے۔ لہٰذا دنیاوی زندگی افلاس اور محتاجی کی گزارنا اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر اطمینان دے لینا کہ ہماری "روحانی ترقی" ہو رہی ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے خود فریبی کے ساتھ ساتھ خدا فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس دنیا کی خوشگواریاں مومن کی زندگی کی لازمی شرط بلکہ ایمان و عمل کا لازمی نتیجہ ہے اور یہاں کی محتاجی اور زبوں حالی قرآنِ کریم کو چھوڑ دینے کی زندہ شہادت۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے انسان کی معاشی زندگی کو اس قدر اہمیت دی ہے اور اس کے لئے مکمل نظام عطا کر دیا ہے۔ قرآنِ کریم کی پہلی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ "حمدیت صرف اور صرف اس اللہ کے لئے ہے جو کائنات کی ہر ذی روح کے لئے سامانِ زیست بلا مزد و معاوضہ عطا کرتا ہے"۔ زمین سے جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے کیا خداوندِ لم یزل ہم سے اس کی قیمت وصول کرتا ہے ہرگز نہیں! انسانی بنائے ہوئے قوانین میں مالیہ، لگان اور نہ جانے اور کتنے ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں۔ لیکن قوانینِ خداوندی کی رُو سے نہ تو بادلوں سے ملنے والے پانی اور نہ ہی دریاؤں سے ملنے والے پانی کا آبیانہ خدا وصول کرتا ہے۔

دعائے ابراہیمی قرآن کریم کے معاشی نظام کی رُوح ہے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (۲/۱۲۶)

مفہوم:۔ ابراہیمؑ نے اس مرکزیت کی بنیاد رکھ دی اور خدا سے التجا کی کہ اے وہ جو تمام کائنات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا ہے! تو ایسا کر دے کہ یہ مقام ساری دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے، امن اور پناہ کی جگہ بن جائے (۳/۹۵) اور ان میں سے جو لوگ تیرے قوانین کی صداقتوں پر یقین اور مستقبل کی زندگی پر ایمان رکھیں، خواہ وہ کہیں کے رہنے والے بھی کیوں نہ ہوں (۲۲/۲۵) انہیں زندگی کی آسائشیں اور سامانِ زیست کی فراوانیاں عطا کر دے (۱۴/۳۷)۔

خدا نے کہا کہ بیشک ان لوگوں کو یہ کچھ ملے گا۔ باقی رہے وہ جو اس سے انکار کریں گے تو ہمارے طبعی قوانین کے مطابق، انہیں بھی زندگی کے عاجلہ مفاد ضرور حاصل ہوں گے (۲۰-۱۸/۱۷) لیکن انجام کار وہ نہایت بے بسی کی حالت میں مصیبت کی زندگی کی طرف کھنچے چلے جائیں گے ـــــ کس قدر سوختہ بخت ہے وہ قوم جس کا ماں یہ ہو!

اس سے ذرا آگے۔ (۲/۱۳۱) میں فرمایا۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ یہ تھا مسلکِ ابراہیمؑ ـــــ یعنی اس ابراہیم کا مسلک کہ جب اس کے نشوونما دینے والے نے اُس سے کہا کہ ہمارے قوانین کے سامنے جُھک جاؤ تو وہ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ان قوانین کے سامنے پوری طرح جُھک گیا ـــــ ان قوانین کے سامنے جن کی رُو سے تمام کائنات کی نشوونما ہو رہی ہے۔

قرآنِ کریم جب معاشی نظام کی بات کرتا ہے تو وہ دراصل ایک نظام کا "فریم ورک" دیتا ہے یعنی ایک چار دیواری کے اندر رہ کر آپ اپنے لئے ایک ایسا نظام وضع کریں جس کی بنیاد اس اصول پر ہو کہ کوئی بھوکا نہ رہے، کوئی کپڑے اور مکان سے محروم نہ رہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک طرف ایک شخص سالانہ ایک ارب سے زائد ٹیکس ادا کرے یا دولت کے بل بوتے پر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور دوسری طرف اُسی ملک میں ہزاروں کی تعداد میں انسان نانِ شبینہ کے لئے محتاج ہوں۔ قرآنِ کریم اپنے کلی معاشی نظام کو بطور نصب العین پیش کرتا ہے۔ قرآنِ کریم جس نظام کی بات کرتا ہے اس میں افرادِ معاشرہ کو سامانِ زیست فراوانی سے ملنا چاہیئے۔ وہ اس نظام کو جس میں انسان کے جسم کی پرورش کے تقاضے بااطمینان پورے نہ ہوتے ہوں خدا کا عذاب قرار دیتا ہے یعنی وہ

نظام جس میں افرادِ معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں اسے عام طور پر بھوک اور افلاس سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۃ النحل میں ہے کہ ہم اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں۔ ایک بستی تھی جو نہایت امن اور اطمینان سے رہتی تھی۔ سامانِ زیست نہایت افراط اور فراوانی سے ان کی طرف چلا آتا تھا، لیکن اس کے رہنے والوں نے خدا کی ان نعمتوں کی قدر نہ کی اور اپنا خود ساختہ غلط نظام اپنے ہاں رائج کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر خوف اور بھوک کا عذاب طاری ہو گیا، رزق کی فراوانیاں بھی ختم ہو گئیں اور امن کی طمانیت بخشیاں بھی (۱۶/۱۱۲) قرآنِ کریم نے جنت کی زندگی کی محسوس علامات کو کچھ یوں پیش کیا ہے کہ

اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ (۲۰/۱۱۸ - ۱۱۹)

اس میں نہ کھانے پینے کے متعلق کوئی پریشانی ہو گی نہ لباس اور نہ مکان کے متعلق کوئی فکرمندی۔

اس میں کیفیت یہ ہو گی کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) ہر شخص کو ہر جگہ پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے گا کسی کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے گی۔ ان آیات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ

۱۔ اگر معاشرہ میں قرآن کے پیش کردہ نظام کے اصول متعین کر دیئے گئے تو اس کا نتیجہ سامانِ زیست کی فراوانی ہو گی اور اگر ان اصولوں سے اعراض برتا گیا تو اس کا نتیجہ بھوک اور افلاس ہو گا جو خدا کا عذاب ہے۔

حضرت صالح کی اونٹنی کو خدا نے اپنی اونٹنی کہا تھا۔ اب خدا تو اونٹنی پر نہ سوار ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اُسے رسل و رسائل کے کام میں لاتا ہے جسے اس نے ناقۃ اللہ کہا تھا۔ یہ ہیں وہ اصول جس پر نظام کی بنیاد رکھی جائے گی۔

۱۔ خدا نے زمین کو تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا ہے۔ (۱۰/۵۵)

۲۔ اس میں تمہارے لئے معاش، یعنی روزی کا سامان ہے۔ (۱۰/۷، ۲۰/۱۵)

۳۔ اس میں بندوں کے لئے رزق ہے۔ (۵/۱۱)

۴۔ رزق کے یہ دروازے ہر صاحبِ ضرورت کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں (۱۰/۴۱)

۵۔ تم اس رزق کو خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ (۲۰/۵۴)۔

۶۔ کسی کو زمین کا مالک سمجھنا، اسے خدا کا شریک سمجھنا ہے (۲/۲۲)

فرعون یہی کہتا تھا کہ یہ زمین میری ہے، اس میں بہنے والے دریا میرے ہیں۔ اس لئے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹/۲۴) میں تمہیں سامانِ زیست مہیا کرنے والا ہوں۔ فرعون جو نظامِ جاگیرداری کی علامت تھا کے دعوے کو باطل

ثابت کرنے کے لئے آیا صاحبِ ضربِ کلیم آیا۔ قرآنِ کریم کے اس اساسی دعویٰ کو اقبالؒ نے اس طرح پیش کیا۔

حقِ زمین را جز متاعِ ما نہ گفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
باطنِ الارض للہ ظاہر است — ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

دوسری طرف سرمایہ داری نظام کی علامت قارون تھا اور تیسری طرف مذہبی پیشوائیت کی علامت ہامان تھا۔ ان تینوں نے آج بھی انسان کو اپنے آہنی پنجہ میں ایسا دبوچ رکھا ہے کہ انسانیت کا ایک ایک قطرۂ خون تینوں چوس رہے ہیں۔ اقبالؒ نے قرآنِ کریم کی تعلیمات کو سمجھ کر یہ کہا تھا کہ

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

انہوں نے زمیندار اور جاگیردار سے للکار کر کہا تھا کہ

دِہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں

اس کے ساتھ ہی زائد از ضرورت دولت کے متعلق قرآن کا یہ فیصلہ سامنے لے آئے کہ۔

ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

اور دین کا ماحصل یہ بتایا۔

کس نگردد در جہاں محتاج کس — نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

جب تک ہمارا "کل" محفوظ نہیں ہوگا اس وقت تک ہم اس عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ دراصل آج ہماری زبوں حالی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارا کل محفوظ نہیں ہے۔ ہم نے دولت کے انبار اکٹھے کر لئے ہیں لیکن اس کے باوجود خوف اور حزن میں مبتلا ہے۔ ہم نے نظامِ زکوٰۃ قائم کر لیا ہے اور اب خیر سے بیت المال بھی قائم ہو گیا۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہم دولت کے انبار لگانے میں مصروفِ عمل ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمارا کل غیر محفوظ ہے۔

آج جس نظامِ زکوٰۃ کو جاری رکھا گیا ہے۔ ایک لمحے کے لئے رُک جائیے۔ سوچئے کہ جہاں زکوٰۃ تقسیم ہوتی ہے اُس منظر کا نظارہ کیجئے۔ انسانیت کی تذلیل کے حتی الامکان مناظر دیکھنے میں آئیں گے۔ پوری قوم کو کاہل و بیکار کیا جا رہا ہے۔ دس دس دن تک دس دس گھنٹے انتظار کے بعد خواتین اور ضرورت مندوں کو دس روپے دیئے جاتے ہیں۔ ہر زکوٰۃ کے دفتر کے سامنے سینکڑوں خواتین، بچے، بوڑھے، نادار، مفلس، مساکین بیٹھے نظر آتے ہیں۔ یہ انسانیت کی انتہائی تذلیل ہے جب کہ خداوندِ کریم نے انسان کو واجب التکریم قرار دیا ہے۔ یہ مناظر اگر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں تو حج کے ایام میں جا کر مکۃ المکرمہ اور مدینہ منورہ میں دیکھیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر

ہے کہ غیر مسلموں کو کسی وجہ سے جانے کی اجازت نہیں ہے ورنہ انسانیت کی تذلیل کے مناظر اور انسانوں کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک اور وہ بھی اجتماعی طور پر جو وہاں دیکھنے میں آتا ہے تو غیر مسلم بے ساختہ پکار اٹھتے کہ ہم غیر مسلم بھلے۔ خیرات کے نام پر چڑیا گھر میں محبوس جانوروں کو جس انداز سے خوراک تقسیم کی جاتی ہے اس سے بھی بدترین شکل اور مناظر آپ کو دیکھنے میں آئیں گے۔ یہ ہے انسان کا وضع کردہ نظام اور وہ ہے خدا کا نظام جس میں انسان بلالحاظ ملک وملت، خون، رنگ، نسل یا کسی بھی امتیاز کے واجب التکریم ہے اور اب تو وطنِ عزیز میں خیر سے بیت المال کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ رہی سہی کسر اس سے پوری ہو جائے گی۔ قرآن کریم نے تین مستبد نظاموں کا ذکر کیا ہے جن میں نظامِ جاگیرداری، نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ مذہبی پیشوائیت شامل ہیں۔ آج کے دور میں ایک اور نظام بھی باقاعدہ طور پر وجود میں آگیا ہے جسے نظام کارخانہ داری کہا جاتا ہے جس کی بنیاد دراصل نظامِ سرمایہ داری پر ہی ہے۔

قرآنِ کریم کے ساری معاشی نظام کی روح یہ ایک آیت ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

سامعینِ گرامی!

ہمیں مذہب کے آہنی شکنجہ میں جکڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ آج سے صرف ایک ہفتہ قبل رمضان کے بابرکت مہینے کے فرائض کی ادائیگی کے بعد ایک ہی صوبے کے ایک ہی شہر میں تین مسلسل عیدیں چاند کی شہادت پر منائی گئیں۔ جہاں چاند کے دیکھنے کے لئے کوئی نظام مقرر نہ ہو سکے۔ وہاں معاشی نظام کی بات کس منہ سے کی جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے عملی نفاذ کے لئے سب سے پہلا قدم کونسا اٹھایا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلا قدم اٹھایا جائے کہ ملک میں موجودہ تمام مذہبی اور سیاسی فرقہ بندیوں کو قانونی طور پر ممنوع قرار دیا جائے۔ جب تک امتِ منتشرہ کو امتِ واحدہ کی شکل میں تبدیل نہیں کیا جائے گا اس وقت یہ کہنا کہ یہاں کسی معاشی یا قرآنی معاشی نظام کا قیام عمل میں آئے گا، ایک خواب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

اُس کے بعد دوسرا قدم زمین اور اس کی پیداوار کو فوری طور پر حکومت اپنی تحویل میں لے۔ جو زمین کاشت کرے گا وہی اس کا مالک ہوگا۔ آپ یہ سُنکر حیران ہوں گے کہ آج تک قومی اسمبلی میں کوئی زرعی ٹیکس نہیں لگایا جا سکا اس لئے کہ قومی اسمبلی کے ممبران کی اکثریت زمینداروں کی ہوتی ہے وہ تو غریبوں کی جھونپڑیوں پر ٹیکس لگاتے ہیں تاکہ ان کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر لے جائیں، ان کی محنت کی کمائی پر یورپ کے نائٹ کلبوں کو رونقیں

بخشیں اور سرکاری اخراجات پر فوج ظفر موج کو عمرے اور حج کروائیں۔ یہ انقلاب صرف اس صورت میں آ سکتا ہے جب ملک کا درمیانی طبقہ یہ فیصلہ کرے کہ قانون ساز اداروں میں نمائندگی درمیانے طبقے نے کرنی ہے۔ جب تک قرآن کو دل و جان سے مصائب و آلام کا مداوا نہ سمجھیں۔ جب تک غریب و مساکین متحد ہو کر سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ نہ کر دیں۔ یہ نظام صرف دعاؤں اور نمازوں سے کسی صورت میں کبھی نہیں آئے گا۔

گردہ ام اندر مقاماتش نگہ لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ

یہ اساس محکم کہاں سے ملے گی۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کُن از اُمّ الکتاب

یہاں میں ایک انتہائی اہم اقتباس پیش کر کے موضوع زیرِ عنوان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسے متشکل اور نافذ کرنے کے لئے طریقِ کار کیا اختیار کیا جائے۔

"جو جماعت کسی مستقل قدر یا غیر متبدل اصول کی پابند نہیں ہوتی وہ اپنے نظام کو نافذ کرنے کے لئے جو طریق بھی چاہے اختیار کر سکتی ہے۔ ان کے نزدیک طریقِ کار کے جائز یا ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو طریق بھی حصولِ مقصد کے لئے ممد و معاون ہو، وہ ان کے ہاں جائز قرار پاتا ہے۔ ان کے نزدیک طریقِ کار کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار یہ ہوتا ہے کہ

(MEANS ARE JUSTIFIED BY THE ENDS ACHIEVED")

دورِ حاضر میں اس کا زندہ ثبوت مارکسزم اور لینن ازم ہے۔ جن کے نزدیک لوٹ مار، توڑ پھوڑ، قتل و غارت گری، دنگا فساد اور اس کے ساتھ جھوٹ، مکاری، عیاری، فریب، سازش وغیرہ نہ صرف جائز بلکہ نہایت مستحسن طریقِ کار ہیں۔ مارکسزم کا یہ فلسفہ اس حد تک اثر انگیز ہو چکا ہے کہ جو جماعتیں اس کی مخالفت کے لئے سامنے آتی ہیں، طریقِ کار وہ بھی اسی قسم کا اختیار کرتی ہیں۔

ان کے برعکس جو جماعت مستقل اقدارِ حیات اور غیر متبدل اصولوں پر ایمان رکھے، اس کے نزدیک ذرائع اور مقصد میں کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد بھی حق پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے ذرائع بھی وہی اختیار و استعمال کر سکتی ہے جو مبنی بر حق ہوں، وہ اس حقیقت پر یقین رکھتی ہے کہ غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ لہٰذا، جو جماعت باطل ہو، لوٹ مار، قتل و غارت گری، خلفشار، انتشار وغیرہ قرآن کے نزدیک سخت مذموم اور جھوٹ، فریب، مکاری، عیاری بدترین جرائم ہیں۔ وہ اس طریقِ کار کو فساد قرار دیتا ہے اور مفسدین اس کے نزدیک بدترین خلائق ہیں۔ اس کا طریق "انقلاب" ہے، فساد نہیں اور ان دونوں میں جو بنیادی فرق ہے

اس کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے، بالخصوص اس لئے کہ آجکل بدقسمتی سے فساد ہی کو انقلاب کہہ پکارا جارہا ہے حالانکہ جسے "انقلاب زندہ باد" کہا جاتا ہے اس سے مفہوم درحقیقت "فساد زندہ باد" ہوتا ہے۔ آج اس نے فساد برپا کردیا، کل کسی اور نے کردیا۔

قرآنِ کریم کے نزدیک خارجی دنیا (یا نظام) میں کوئی صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس تبدیلی کی متمنی جماعت کے افراد کے قلب و نگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق تبدیلی پیدا نہ ہو، وہ قلب و نگاہ کی اس داخلی تبدیلی کو انقلاب قرار دیتا ہے۔ یعنی انقلاب، قلب کی گہرائیوں سے اُبھرنے والے مقاصد کے مظاہرہ کا نام ہے نہ کہ محض خارج میں فساد برپا کردینے کا نام۔ قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی کا مظاہرہ، انسان کے اخلاق و کردار سے ہوتا ہے۔ اسے وہ "اعمالِ صالحہ" کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی قلب و نگاہ کی بنیادی تبدیلی کا نام ایمان ہے اور اس ایمان کے عملی مظاہرے کا نام اعمالِ صالحہ ــــ اور ان دونوں کے حاملین کا نام ــــ جماعتِ مومنین ــــ یہ ہے وہ جماعت جو قرآن کے معاشی نظام (بلکہ ہر قسم کے قرآنی نظام) کی داعی بن کر اٹھتی ہے اور انہی کے ہاتھوں سے یہ انقلاب ہویدا ہوتا ہے۔ قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی کا کام، ایک دن کی بات نہیں، یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب بھی ہوتا ہے اور کافی وقت کا متقاضی بھی۔ اس مرحلہ میں صبر طلبی ہی دشواری نہیں ہوتی۔ اس سے آگے بڑھ کر ایک اور دشواری اور بھی سامنے آتی ہے جو بڑی الجھن پیدا کرنے کا موجب بن جاتی ہے۔ وہ دشواری یہ ہے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنے کا یہ مرحلہ بڑا غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ اس میں بظاہر نہ کوئی حرکت نظر آتی ہے نہ حرارت۔ اس لئے سطح بین نگاہیں اسے "بے عملی" سے تعبیر کردیتی ہیں اور ان کے اس طعن سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اس جماعت کے زیرِ تربیت افراد، اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ دنیا بہت آگے نکلی جارہی ہے اور ہم یونہی اپنا وقت ضائع کررہے ہیں۔ لیکن قرآنی جماعت نہ اغیار کے اس قسم کے طعنوں سے متاثر ہوتی ہے نہ خود اپنے اندر کے افراد سے مصالحت کی خاطر اپنا راستہ بدلنے کے لئے تیار ــــ خود نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین کی مکی زندگی کی تیرہ سو سالہ طول طویل (اور بظاہر بے حس و حرکت) مدت اسی صبر طلبی عشق کی مظہر تھی۔ جب اس جماعت کے افراد میں قلب و نگاہ کی ایسی تبدیلی اور سیرت و کردار میں ایسی پختگی پیدا ہوجاتی ہے تو پھر وہ اس نظام کے قیام کے لئے عملی قدم اٹھاتی ہے اور اس میں کوئی حربہ ایسا استعمال نہیں کرتی جسے قرآن فساد قرار دیتا ہو۔"

عزیزانِ گرامی!

(نظامِ ربوبیت صفحہ ۱۶-۲۱۵)

کسی بھی اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ایتائے زکوٰۃ ہے جو قرآنی معاشی نظام کا ایک اہم ستون ہے یعنی تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا لیکن زکوٰۃ یہاں بزورِ شمشیر لی جاتی ہے۔ نہیں تو آپ نے حلفیہ بیان داخل کروانا ہوگا کہ "مجھ سے زکوٰۃ اس لئے نہ لی جائے کہ میں فقہ جعفریہ پر یقین رکھتا ہوں۔" آپ نے دیکھا خدا کو جو جُل دینا تھا سو دیا ساتھ ہی ساتھ حکومت کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک دی اور زکوٰۃ کی چھٹی.....

یہ مضمون طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۹۲ء میں پڑھا گیا۔

قمر پرویز

قرآن کا معاشی نظام

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا ہے کہ "رسول اس لئے آتا ہے کہ زمانے کے طوفانوں پر تسلط پاکر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کردے۔ اس کے نفسِ قدسی میں ایسی ولولہ انگیز قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیائے انسانیت میں انقلاب برپا کردیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اُس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے اس لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جاننے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اُس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے اور اس کے پیغام کی رُوح سے جس قسم کی دنیائے انسانیت و ثقافت اُبھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

آغازِ نبوت ہی سے حضورؐ کے پیشِ نظر ایک مملکت کا حصول تھا۔ جس میں ایسا نظام قائم کیا جاسکے جس کی نظیر کہیں بھی نہ ملتی ہو۔ یہی مقصودِ رسالت تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس نظام یعنی دینِ خداوندی کے ماحصل کو ایک شعر میں سمو دیا ہے کہ اس پر غور کرنے سے بصیرت وجد میں آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

نظامِ خداوندی میں اطاعت نہ کسی فرد کی ہوتی ہے نہ افراد کی یا کسی ایک گروہ کی۔ اس میں اطاعت قوانین کی ہوتی ہے۔ ان قوانین کی اطاعت میں بھی کسی قسم کا جبر نہیں ہوگا۔ اسے تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو ان کی فرماں روائی کو بطیبِ خاطر قبول کرلیں ان پر ان کا اطلاق ہوگا۔ انہی کو اُمتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جائیگا۔

علامہ اقبالؒ کے شعر کے دوسرے گوشہ کی طرف آئیے جہاں یہ کہا ہے کہ اس نظام میں نہ کوئی سائل ہوگا نہ کوئی محروم اس گوشے کا تعلق معاشیات سے ہے۔ یوں تو معاشیات کی تاریخ عالم میں بڑی اہمیت رہی ہے لیکن ہمارے دور

میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہوگئی ہے کہ اس دَور کو کہا ہی عصرِ معاشیات جاتا ہے۔ اس کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی ہے کہ اقوامِ عالم کی انتہائی کوششوں کے باوجود اس مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں مل رہا۔ نظامِ سرمایہ داری جو اس وقت دنیا میں کم و بیش ہر جگہ رائج ہے اس کے تین بنیادی ستون ہیں۔

(۱) ہر شخص اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کا خود ذمہ دار ہے۔

(۲) ذرائع پیداوار اور وسائلِ رزق انفرادی ملکیت میں رہتے ہیں۔

(۳) جو شخص جتنی دولت کما لے وہ اس کا مالک قرار پاتا ہے۔

دوسری طرف نظامِ خداوندی ان تینوں ستونوں کو گرا کر اپنی عمارت نئی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ جہاں تک افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے وہ ان کا پورا کرنا نظامِ مملکت کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ انسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرماتا ہے کہ "ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی" (۶/۱۵۱)۔ اس ضمن میں اس بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانوں کے متعلق جو ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لی ہے وہ اُسے براہِ راست پورا نہیں کرتا۔ ان ذمہ داریوں کا پورا کرنا اس نظام کے ذمہ ہوتا ہے جو خدا کے نام پر قائم کیا جاتا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت حضرت عمرؓ نے کچھ یوں کر دی کہ

"تم میں سے کوئی شخص رزق کی طلب و جستجو سے باز نہ رہے اور یہ نہ کہتا رہے کہ یا اللہ! مجھے رزق دے۔ یاد رکھو! آسمان سے سونا نہیں برسا کرتا۔ اللہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔"

یاد رکھیئے! اس روئے زمین پر جہاں بھی کوئی حکومت نظامِ اسلامی قائم کرے گی اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ ذرائع رزق اس کی تحویل میں ہوں۔ اور ذرائع رزق میں بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے۔ زمین کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خدا کی ملکیت ہے اس لئے کسی فرد یا افراد کے گروہ کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اس کو یعنی زمین کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لے۔ حضور نبی اکرمؐ نے اس نکتہ کی وضاحت یوں کر دی کہ

"زمین اللہ کی ملکیت ہے اور انسان اللہ کے بندے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔"

عربوں کے ہاں زرعی نظامِ معیشت نہیں تھا۔ اس لئے ان کے ہاں چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی تھے۔ اس پر بھی حضورؐ نے اس امر کی تجدید فرما دی کہ زمین کسی کو بٹائی پر نہیں دی جا سکتی۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ

"حضرت رافعؓ بن خدیج نے ایک زمین پر کاشت کی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اُدھر سے ہوا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ "یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی؟ رافعؓ

نے کہا کہ " یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا "۔ حضورؐ نے فرمایا کہ " تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو"۔ اس طرح سود کے بارے میں بات صاف ہو گئی۔

اب دیکھئے کہ ایک غریب کاشت کار کسی دولت مند کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے ایک ہزار روپیہ بطور قرض دے دو تاکہ میں فلاں قطعۂ زمین خرید لوں۔ میں تمہیں اصل زر کے ساتھ اتنی زائد رقم بھی دے دوں گا۔ وہ جاگیردار اس سے کہتا ہے کہ نہیں جناب، یہ زائد رقم تو سود ہوگی جو حرام ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ وہ زمین خود خرید لیتا ہوں۔ تم اس میں کاشت کرو اور پیداوار میں سے آدھا مجھے دے اور نصف خود رکھ لو۔ ہمارے مروجہ قانون شریعت کی رُو سے ایسا کرنا بالکل حلال اور طیّب ہے۔ لیکن سوچئے کہ درحقیقت یہ سودی کاروبار کی انتہائی شکل ہے۔ حضورؐ نے اسی لئے اس کی ممانعت فرما دی تھی۔

زمین کے بعد ہم لیتے ہیں مال و دولت کو۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم نے بنیادی اصول یہ دیا ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت اور طاقت کے مطابق کام کرے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنی ضرورت کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے دے دے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم میں دیکھئے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ " اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ تم یہ کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے وہ سب کا سب "۔ (۲/۲۱۹)۔ اس طرح قرآن نے SURPLUS MONEY کا وجود ختم کر دیا جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ اب آیئے ہم دیکھیں کہ ذاتی ضروریات کا تعین کیسے کیا گیا یا کرنا چاہیئے۔ ذاتی ضروریات کے سلسلے میں سربراہِ حکومت خود اپنے آپ کو بطور نمونہ پیش کرتا تھا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق،

" حضورؐ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے "۔

میں یہاں یہ نکتہ عیاں کر دوں کہ حضورؐ اس مملکت کے سربراہ تھے جو دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں تک فاضلہ دولت کا تعلق ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ

" مرض الموت کے وقت حضورؐ کے ہاں چند دینار کہیں سے آئے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں بیت المال میں بھیج دو تاکہ ان سے حاجت مندوں کی ضروریات پوری ہوں لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ہو

گئے۔ آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا کہ وہ دینار لاؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھا اور کہا محمدؐ کا اپنے رب کے متعلق کیا گمان ہوگا جب وہ اس سے ملے اور اس کے پاس یہ دینار ہوں۔ حضورؐ نے انہیں خود بیت المال میں بھیجدیا۔"

اب آیئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آیا معاوضہ صرف محنت کا ہے یا سرمایہ کا بھی۔ قرآن کی رُو سے ربٰو کے معنی ہیں اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ قرآن کا یہ فیصلہ ہے کہ

"انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے (۵۳/۳۹)

سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہٰذا لین دین کے جس معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو وہ ربٰو ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے حرام ہے اور خدا اور رسولؐ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ایک دوکاندار آپ سے قرض مانگتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنے روزگار میں کچھ اضافہ کر سکے۔ آپ اسے روپیہ دے دیتے ہیں لیکن بطور قرض نہیں بلکہ بطور حصہ دار کے۔ وہ دن رات محنت شاقہ سے کاروبار کرتا ہے۔ لیکن اس کے منافع میں آپ برابر کے شریک ہوجاتے ہیں۔ وہ آپ کو منافع کا حصہ دیئے چلا جاتا ہے لیکن آپ کا اصل زر اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربٰو نہیں؟ جہاں معاوضہ محنت کا نہیں اسے قرآن جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کا اصول ہے کہ معاوضہ محنت کا ہوگا۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اور ہے۔ اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات آتی نہیں کہ بیع اور منافع اور ربٰو میں کیا فرق ہے۔ ایک سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے اسے دس روپے اصل رقم سے زائد وصول ہوجاتے ہیں۔ دوسرا آدمی کسی کو سو روپے قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے۔ اس سے اُسے بھی دس روپے اصل زر سے زیادہ ملتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہ دونوں اصل زر پر زائد ہیں تو ان میں فرق کیا ہے۔ وہ بیع اور ربٰو کو ایک جیسا سمجھتے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کی بھول ہے۔ بیع سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس آجاتا ہے اور دوکاندار کو اس کی محنت کا معاوضہ، سرمایہ کے علاوہ ملتا ہے۔ یہ حلال ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ لیکن ربٰو میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس میں جو کچھ ملتا ہے یعنی زیادہ وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے جو حرام ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع یعنی تجارت میں انسان RISK لیتا ہے۔ یعنی اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور ربٰو میں RISK نہیں ہوتا۔ لیکن حلت اور حرمت کے لئے یہ معیارِ تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط RISK ہی ہو تو جوا عین حلال ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں تو ہر داؤ میں رِسک ہوتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے ربٰو کا مسئلہ کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اس میں جو دشواریاں آجکل پیش آرہی ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) ربٰو کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنہیں قرآنِ کریم حرام قرار دیتا ہے لیکن ہماری مروّجہ شریعت اسے حلال قرار دیتی ہے۔ مثلاً زمین کی بٹائی یا مضاربت یعنی کاروبار میں ایسی شراکت جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے۔ ہمارے اربابِ شریعت اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرلیں۔ اس لئے وہ ربٰو کی تعریف ایسی کریں گے جس کی رُو سے یہ شکلیں ربٰو کی شق میں نہ آسکیں۔

(۲) سرمایہ دار طبقہ بلا محنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ محنت کے تصوّر سے انہیں پسینہ آجاتا ہے۔ اس لئے وہ ربٰو کے قرآنی تصوّر کی طرف آنا ہی نہیں چاہتا۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے۔ بجائے اس کے ہم اس نظام کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے یہ ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکہ دے لیں کہ یہ قرآنی ہو گیا ہے لیکن وہ پیوند، اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ یہ پیوندکاری کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے۔

آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ بینکوں کے سود کے بارے میں ہمارا قدامت پرست طبقہ کیوں مخالفت کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات اسے اسلامی نظامِ معیشت کے خلاف پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت بینکوں کے سود کا مسئلہ موجود نہیں تھا۔ یعنی جب ہماری فقہ مرتّب ہوئی ہے۔ اس لئے اس کو اب جائز کی لسٹ میں داخل کرنا ان کے نزدیک "بدعت" ہے۔ اگر یہ شکل اس وقت موجود ہوتی تو جس طرح زمین کی بٹائی اور مضاربت وغیرہ جائز قرار دے گئی تھیں ممکن ہے یہ بھی اسی لسٹ میں شامل ہو جاتا۔ بینک کا سود تو بٹائی وغیرہ کے مقابلے میں EXPLOITATION کی بہت نرم شکل ہے۔

ہمارے معاشی مسائل کے حل کا طریق یہ نہیں کہ کبھی زمین کی ملکیت کے سوال کو زیرِ بحث لے آئے اور کبھی بینک کے سود کے بارے میں بحث چل نکلی۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ متعیّن کیا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیا اور یہ کام ہمارے قدامت پرست طبقہ کے بس کا نہیں۔ اس لئے کہ

(۱) ان کے نزدیک وہ معاشی نظام جو عباسی ملوکیت کے زمانے میں مرتّب ہوا تھا عین اسلامی ہے۔

(۲) ان کی ذہنیت یہ قرار پا چکی ہے کہ جو بات اسلام کے نام سے متعارف ہو کر چلی آرہی ہے اس پر نظرِ ثانی کی کوئی ضرورت نہیں۔

(۳) ان کے نزدیک قرآنِ کریم دین میں واحد اور آخری سند نہیں۔

یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو قرآن کریم کو آخری سند اور حجت تسلیم کریں اور عصرِ حاضر کے اقتصادی تقاضوں پر ان کی نگاہ ہو۔

جب اس طرح پہلے یہ طے ہو جائے کہ اسلام معاشی نظام کیا ہے تو اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ہم اپنے موجودہ نظام سے اسلامی نظام تک کس طرح منزل بہ منزل پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی پہلے منزل کا تعین کر لیا جائے اور اس کے بعد اس تک بتدریج پہنچنے کے طریق و وسائل پر غور کر کے چلنا شروع کر دیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اسلامی نظام، اس کی حکمتِ بالغہ، اس کی انفرادیت اور اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کے دعوے کی صداقت کو تعلیم کے ذریعہ آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں اس طرح جاگزیں کیا جائے کہ اس کا مطالبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے اور وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس طرح مضطرب و بیتاب ہوں جس طرح مچھلی پانی میں جانے کے لئے بے قرار ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور ہم ان مسائل کو فرداً فرداً لے کر انہیں اسی طرح بحث و نظر کا موضوع بناتے رہے جس طرح اب تک بناتے چلے آرہے ہیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ہم اپنا وقت اور توانائیاں ضائع کر رہے ہیں اور اصل مسئلہ جوں کا توں رہے گا۔ اگر آپ بٹائی، مضاربت وغیرہ کو جائز رکھ کر بینک کے سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو آپ BANKING SYSTEM کو ختم کر دیں گے۔ کیونکہ سرمایہ دار طبقہ اپنا روپیہ بینک کے کاروبار میں لگائے گا ہی نہیں لیکن اگر آپ قرآن کا معاشی نظام اختیار کر لیتے ہیں تو اس میں اس قسم کی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اس وقت افراد کے پاس فالتو دولت رہے گی ہی نہیں جو اس پر نفع کمانے کا سوال پیدا ہو۔ دولت ملت کی تحویل میں رہے گی اور وہیں سے تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ ان ضرورت مندوں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر نفع کمانے کا تصور تک بھی باقی نہیں رہے گا۔

حقائق و عبر

"اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قانون ساز نہیں ہو سکتا"

شریعت ایکٹ منظور کرنے والے ارکان اسمبلی رکنیت سے محروم ہو گئے لاہور ہائی کورٹ میں جھنگ کے وکیل کی رٹ درخواست۔ قومی اسمبلی اور سینٹ کے تمام ایسے ارکان کے خلاف ریفرنس چیف الیکشن کمشنر کو بھجوائے جائیں۔ درخواست میں مؤقف رٹ پر فیصلہ تک شریعت ایکٹ ۱۹۹۱ء پر عمل درآمد روک دیا جائے۔ پاکستان کے اٹارنی جنرل کو عدالت میں طلب کر لیا گیا

لاہور (وقائع نگار) جھنگ کے ایک وکیل ملک رب نواز نے لاہور ہائی کورٹ میں ایک رٹ درخواست دائر کی ہے جس میں مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ ۱۹۹۱ء کا شریعت ایکٹ منظور کرنے والے قومی اسمبلی اور سینٹ کے ارکان آئین کی دفعہ ۶۳ کے تحت اپنی سینٹ اور اسمبلی کی رکنیت سے محروم ہو چکے ہیں اس لئے قومی اسمبلی اور سینٹ کے تمام متعلقہ ارکان کے خلاف ریفرنس چیف الیکشن کمشنر کو بھجوانے کی ہدایت کی جائے اور رٹ درخواست کے فیصلہ تک شریعت ایکٹ مجریہ ۱۹۹۱ء پر عمل درآمد روک دیا جائے۔ فاضل عدالتِ عالیہ کے مسٹر جسٹس شیخ ریاض احمد نے اس رٹ درخواست کی سماعت کے بعد پاکستان کے اٹارنی جنرل مسٹر عزیز اے منشی کو اس اہم قانونی نکتہ پر عدالت کی معاونت کے لئے ۲۰ اپریل کو عدالت میں طلب کر لیا ہے۔ رٹ درخواست پر جو درخواست گزار کی جانب سے مسٹر محمد رفیق باجوہ ایڈووکیٹ نے دائر کی ہے۔ وفاقِ پاکستان بذریعہ وفاقی سیکرٹری قانون چیئرمین سینیٹ اور اسپیکر قومی اسمبلی کو فریق بناتے ہوئے مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ صرف خدا تعالیٰ کی ذاتِ باری ہی قانون ساز ادارہ ہے اور خدا تعالےٰ کے سوا اور کوئی قانون ساز نہیں ہو سکتا جب کہ خدا تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اپنے قوانین وضع کر دئے ہیں جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ قرآنِ مجید میں کوئی ترمیم، تبدیلی، اضافہ نہیں ہو سکتا نہ ہی قرآنِ مجید سے کوئی لفظ نکالا جا سکتا ہے۔ اس طرح قرآنِ مجید مسلمانوں کے لئے ایک مقدس قانونی کتاب کی حیثیت بھی رکھتی ہے جو کسی شک و شبہ یا ابہام سے بالاتر ہے اور قرآنِ مجید کے مطابق مسلمان صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہی کے پابند ہیں انہیں کسی اور کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ مسلمان قرآنِ مجید کے سوا کسی دوسرے قانون کے پابند نہیں ہو سکتے۔ رٹ درخواست میں متعدد آیاتِ قرآنی کے حوالے دیتے ہوئے مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ بدقسمتی سے پاکستان کا ۱۹۷۳ء کا آئین مختلف مکاتبِ فکر اور تصورات پر مبنی جو تضادات کا مجموعہ ہے۔ نتیجتاً

آئین کے تحت اسلام ریاست کا دین قرار دئے جانے کے باوجود اسے آئین کے طور پر اختیار نہیں کیا جا سکا جب کہ خدا تعالیٰ نے اسلام کو واضح طور پر دین قرار دیا ہے اور مسلمانوں کے لئے یہ دین آئین کی حیثیت رکھتا ہے۔ رٹ درخواست میں کہا گیا ہے کہ ہمارے آئین میں مغربی طرزِ جمہوریت کو اختیار کیا گیا ہے جب کہ آئین میں نام نہاد سوشلزم کے اصول بھی اختیار کئے گئے ہیں اور بلاخوفِ تردید یہ امر واقع کہ مغربی طرزِ جمہوریت اسلام کے تصورات کے قطعاً منافی ہے اور سوشلزم طرزِ جمہوریت کے منافی ہے۔ رٹ درخواست میں کہا گیا ہے کہ اسلامی آئین کی رُو سے حاکمیت صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے جب کہ مغربی جمہوریت میں حاکمیت کا تصور عوام کو دیا گیا ہے اور اگر خدا تعالیٰ کی حاکمیت کا تصور اور عوام کی حاکمیت کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا جائے تو اس سے شرک کا پہلو نکلتا ہے۔ چنانچہ ہمارا آئین شرک پر مبنی ہے۔ رٹ درخواست میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۹۱ء میں منظور کئے گئے شریعت ایکٹ میں قرآن و سنت کو پاکستان کے برتر قانون کا درجہ دیا گیا ہے بشرطیکہ اس کے ذریعے موجودہ سیاسی نظام اور موجودہ نظامِ حکومت متاثر نہ ہو جس سے یہ واضح ہے کہ شریعت کو سیاسی نظام اور موجودہ حکومت کے تابع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ شریعت ایکٹ میں یہ لکھ دینے کے باوجود قرآن و سنت برتر قانون ہے۔ موجودہ سیاسی نظام اور نظامِ حکومت ہی پاکستان کا برتر قانون رہے گا۔ چنانچہ شریعت ایکٹ دفعہ ۳ خدا تعالیٰ کے اختیارات کی نفی کرتی ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ سیاسی نظام اور موجودہ نظامِ حکومت قرآن و سنت کے اصولوں کے منافی ہے۔ رٹ درخواست میں استدعا کی گئی ہے کہ قومی اسمبلی اور سینیٹ کے جو ارکان شریعت ایکٹ مجریہ ۱۹۹۱ء کو منظور کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ قومی اسمبلی کے اسپیکر اور سینیٹ کے چیئرمین کو ان کی رکنیت کا معاملہ چیف الیکشن کمشنر اس معاملہ میں قانون کے مطابق کارروائی عمل میں لائیں اور اگر چیف الیکشن کمشنر کی رائے میں شریعت ایکٹ منظور کرنے والے سینیٹ اور قومی اسمبلی کے ارکان نااہل ہو چکے ہیں تو ان کی سینیٹ اور قومی اسمبلی کی رکنیت ختم کر دی جائے اور سینیٹ اور قومی اسمبلی کی تمام متعلقہ نشستیں خالی قرار دی جائیں۔ رٹ درخواست میں یہ استدعا بھی کی گئی ہے کہ شریعت ایکٹ مجریہ ۱۹۹۱ء کو پاکستان کے آئین اور قرآن و سنت کے منافی قرار دیا جائے۔

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت (کراچی) ۱۵ اپریل ۱۹۹۲ء)

آصف جلیل

اسلامی لیبل

اسلام وہ نظامِ زندگی ہے جسے اللہ تعالےٰ نے بنی نوعِ انسان کے لئے تجویز کیا ہے۔ اسے عملاً نافذ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو خوف اور حزن سے نجات مل جاتی ہے۔ یہ نظام صرف اپنی مکمل شکل ہی میں مطلوبہ نتائج مرتب کرتا ہے۔ اس میں کسی قسم کے ردّ و بدل سے کبھی بھی وہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے جو اس کی غیر متبدل شکل پر عمل کرنے سے حتمی طور پر نکلتے ہیں۔ بالکل گھڑی کی طرح۔ اگر اس کا کوئی پُرزہ نکال دیا جائے تو وہ صحیح وقت نہیں بتاتی۔

اس نظام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی زندگی میں متشکل فرمایا اور آپؐ کے بعد صحابہ کرام رضؓ نے اسے آگے بڑھایا۔ لیکن جب ملوکیت نے خلافت کی جگہ لے لی تو اس مشینری کے کل پرزوں کو ایک ایک کر کے نکال دیا۔ اور ان کی جگہ اپنے ناجائز مقاصد کی بھٹی میں ڈھالے ہوئے پرزوں کو فٹ کر دیا۔ عوام النّاس کی مخالفت سے بچنے کیلئے غیر قرآنی نظریات پر اسلامی ملمع سازی کا عمل شروع کر دیا گیا جو آج تک جاری ہے۔ کتنی ہی طاغوتی قوتوں نے اپنے مزموم مقاصد کی تکمیل کی خاطر اسلام کے مقدس نام کو استعمال کیا۔ بے شمار غیر قرآنی قوانین مرتب کئے گئے اور ان پر اسلام کی مہر ثبت کر دی گئی۔ آج وہی قوانین اس حد تک مسلمانوں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں کہ ان پر نظرِ ثانی کی کسی کوشش کو اسلام پر حملہ تصوّر کیا جاتا ہے اور ان کے دفاع کے لئے لوگ جانیں تک دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی تھی۔ لیکن اس بنیاد کو ہلانے کی ناکام کوشش کے لئے اسلام ہی کا سہارا لیا گیا تھا۔ کل مغربی جمہوریت غیر اسلامی تھی آج عین اسلامی ہے۔ ایک گروہ نے سوشلزم کو اسلام کی ضد بنایا اور دوسرے نے اسے مشرف بہ اسلام کر دیا۔ کسی نے حصولِ اقتدار کیلئے اسلام کا نعرہ لگایا اور کسی نے اپنی آمریّت کو حتی الامکان طول دینے کیلئے۔

مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں ان کی سلامتی خطرے میں ہے لیکن زعماؤ مشائخ اس صورتِ حال پر محض اپنے موقف کو تقویّت پہنچانے کی خاطر گلا پھاڑ پھاڑ کر اسلام اسلام پکار رہے ہیں اور اس شور میں حقیقی (قرآنی)

اسلام کی آواز سرگوشیوں کی مانند ہے۔ سبزی منڈی کا سا سماں ہے، جس میں ہر شخص گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے پکار رہا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس عالمی منڈی میں ہر شئے پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہے جو مسلمانوں کے جذبات بھڑکانے کیلئے سب سے زیادہ مؤثر ہتھیار ہے۔ اس لئے اس کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔

لیکن..... سچ اور جھوٹ، کھرے اور کھوٹے، حق و باطل کی پہچان کے لئے ہمارے پاس ایک پیمانہ ایک معیار موجود ہے۔ کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ہاتھ بڑھا کر طاق پر رکھے ہوئے قرآن کریم کو اٹھا کر مٹی جھاڑیں اور سبز غلاف سے نکال کر اسے پڑھیں اور عقل و تدبّر کی رُو سے سمجھیں۔ پھر دیکھیں کس طرح ہماری سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہو جائیں گی اور حقیقت سورج کی طرح روشن ہو کر ہمارے سامنے آجائے گی۔ ہمارا ہر فیصلہ دلائل و براہین پر مبنی ہوگا۔ اندھے جذبات پر نہیں۔ پھر ہامان کا کوئی نمائندہ کسی بھی باطل نظریئے کو اسلام کے غلاف میں لپیٹ کر پیش نہیں کر سکے گا۔ اسلام فروشی کے کاروبار کے مکمل خاتمے کیلئے ہر مسلمان کے لئے قرآن کریم کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

جو معاشرہ انفرادی مفادِ خویش کے نظریہ پر قائم ہوگا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا اور جس نظام کی بنیادیں نوعِ انسانی کے مفادِ کلّی پر ہوں گی وہی انسانیت کی ربوبیت کی ضامن اور انسانی ذات کی نشوونما کا کفیل ہوگا۔

صرف اچھے قانون کا ہونا کافی نہیں، اس قانون کے پیچھے قوّتِ نافذہ کا ہونا بھی ازبس ضروری ہے۔

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت

علامہ غلام احمد پرویزؒ

ربوبیّت

۴

آپ ایک طوطا پالتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے اسے پنجرے میں رکھتے ہیں تاکہ اُسے بلّی دبوچ کر نہ لے جائے۔ اس کے ساتھ ہی آپ اس کے پانی اور دانے کا بھی انتظام کرتے ہیں تاکہ اس کی پرورش ہوتی جائے۔ پھر آپ ہر روز بڑی محنت سے اُسے بولنا سکھاتے ہیں۔ اس کے لئے خاص احتیاط برتتے ہیں کہ وہ اچھی باتیں سیکھے۔ بُری باتیں نہ سیکھے۔

اس تمام پروگرام کو عربی زبان میں ربوبیّت کہتے ہیں یعنی کسی کی پرورش کرنا، تربیت کرنا اور ایسا کرنے والے کو رَبّ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو رَبّ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس نے انسانوں کی پرورش کے لئے رزق کا سامان پیدا کر دیا ہے اور ان کے اندر علم حاصل کرنے اور بلند اخلاق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں نہ پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہے، نہ پہننے کو کپڑے، نہ رہنے کے لئے مکان، نہ بیماری میں ان کا علاج ہوتا ہے، نہ اُن کے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے۔ وہ جاہل رہ جاتے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کی پرورش اور ان کے بچوں کی تربیت نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خُدا نے لوگوں کی پرورش

کے لئے جو کچھ دے رکھا ہے اس کا صحیح انتظام نہیں کیا جاتا۔

مومنوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کریں جس سے تمام لوگوں کی پرورش بھی ہوتی جائے اور ان کے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت بھی۔ جس جگہ اس قسم کا انتظام ہو اُسے اسلامی معاشرہ کہتے ہیں اور جس طریق سے ایسا انتظام کیا جاتا ہے اسے اسلامی معاشرت۔ معاشرت کے معنی ہیں مل جُل کر رہنا۔

R A B U B I Y Y A T

You buy a parrot with the purpose of bringing him up. You carefully put the bird in a cage, so that he may not be taken away by a cat. Then you provide him food and water to promote the growth of his body. You also take pains to teach him mimicry and take care that he learns to imitate some good words. In Arabic language this whole programme is called " Rabubiyyat", which means to provide nourishment, physical as well as mental. The One Who does so is called "Rabb". We use the word "Rabb" for Allah because He has created means for the nourishment of human body and has also created the faculty of learning in man. But inspite of all that, you know that there are so many people in the world who do not get enough food to appease their appetite, nor enough clothes to cover their bodies, nor do they own houses to live in, not have they got enough means to get themselves treated during illness and nor have they any arrangement for the education of their children. In other words, they have not got enough means either of their own nourishment or for the physical and mental development of their children. Why it so happens inspite of the fact that Allah has provided enough means for the maintenance of human beings? This is because the proper arrangements for the distribution of means of nourishment do not exist.

It is the duty of " Momins" to make adequate arrangements so that all human beings are properly fed and their children are brought up in a proper way. The society in which such arrangements exist is called " An Islamic Society"; and the way in which it gets accomplished is called "Islami Moashrat", which means to live a life of Mutual Cooperation, under Divine guidance.